

# سرکشیرہ

ادیبہ بیزی

اسلم کمال

ہم سے باقی ہے رسمِ کج کلہی
ہم حوادث میں سر کشیدہ رہے

# سرکشیدہ

ادیبہ بزمی

اِدارۂ فروغِ اُردُو۔ لاہور

بار اوّل ـــــــــــ ایک ہزار

محمد طفیل پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا۔

# فہرست

اپنی امّاں کے نام!

# تعارف

ادیبہ بزمی کی نگارشات کے اس مختصر مجموعے کو جس میں انشائیے، افسانے اور تاثرات کئی چیزیں شامل ہیں کسی تعارف کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے کہ جب یہ چھپی ہوئی شکل میں کسی خوش ذوق قاری کے ہاتھ میں پہنچتا تو وہ اپنے ہر جاننے والے سے کہتا کہ بھئی! یہ کتاب ضرور پڑھنا۔ بہت اچھی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ سلسلہ شروع ہو جاتا تو برابر اسی طرح جاری رہتا۔ اب جب کہ کتاب کو متعارف کرانے کی روایتی رسم مجھے پوری کرنی ہے تو میں صرف یہی بتانے کی کوشش کروں گا کہ اس مجموعے میں کون کون سی باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر وہ کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں۔

اس مجموعے کی ہر تحریر کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی بنیاد ذاتی تجربے پر ہے — ایسے ذاتی تجربے جو ہماری گھریلو اور کاروباری زندگی میں پیش آنے والے واقعات میں سے ابھر ابھر کر ہمارا معمول بن جاتے ہیں اور ایسے تجربے جنھیں ہمارے وہ باہمی رشتے جنم دیتے ہیں جن میں الجھے بغیر زندگی بسر کرنا محال ہے۔ میاں، بیوی، بہن، بھائی، اولاد، ہمسائے، دفتر میں ساتھ کام کرنے والے، بس میں ساتھ سفر کرنے والے اور دکانوں میں شانے سے شانہ ملا کر سودا خریدنے والے ان سب سے ہمارا ایک خاص طرح کا رشتہ ہے اور ہر رشتے کے مخصوص تقاضے ہیں کہ اگر طرفین انھیں توازن اور اعتدال کے ساتھ پورا کرتے رہیں تو زندگی بڑے مزے سے گزرے، لیکن مشکل یہ ہے کہ عملاً ایسا ہوتا نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان نوع بہ نوع رشتوں کے طفیل انسان کو قدم قدم پر نئے سے نئے مسئلے اور نئی سے نئی الجھن سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ادیبہ بزمی نے معاشرتی رشتوں کے پیدا کیے ہوئے انھیں گوناگوں مسئلوں اور الجھنوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب مسئلے اور یہ ساری الجھنیں ادیبہ بزمی کی غیر رسمی اور غیر مکلّف تحریروں میں

نہ مسئلے باقی رہتے ہیں اور نہ اُلجھنیں دکھائی دیتے ہیں۔ واقعات اور ان واقعات میں سے ابھرنے والے کردار دونوں تکلّف سے بَری ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہر واقعے میں حادثہ اور ہر کردار میں مجسمہ بننے کی صلاحیت ہے نہ واقعہ حادثہ بنتا ہے اور نہ کردار مجسمہ۔ یہ ان تحریروں کا دوسرا بڑا حسن ہے۔ اور حسن اس طرح پیدا ہوا ہے کہ ادیبہ بزمی نے زندگی کے ہر اس تلخ تجربہ کو جو عام حالات میں دل میں ایک داغ چھوڑ جاتا ہے، زندگی کا معمول سمجھ کر ہنسی خوشی جھیلا اور اس کے اثرات کو بڑی خوش دلی اور خوش طبعی سے قبول کیا ہے اور پھر ہر انسان کی تکلیف دہ اور مضحکہ خیز حرکات کو اس کی فطری کمزوری سمجھ کر معاف کیا ہے۔ اس طرح تلخ تجربوں اور حادثوں کی رُوداد اور دل جلانے والے کرداروں کی حرکات وسکنات کے بیان میں لطیفے کی سی شگفتگی اور خوشگواری پیدا ہو گئی ہے۔ یہ سب حادثے جس طرح ادیبہ بزمی کے ساتھ پیش آئے ہیں اسی طرح ہم پر بھی گزرتے ہیں لیکن ہم حادثوں کو حادثہ سمجھ کر ان کے آگے سَپر ڈال دیتے ہیں اور یوں ہماری پسپائی ہماری مایوسی اور محرومی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ادیبہ بزمی نے حوادث کے مقابلہ میں سینہ سپر رہنے کو اپنی عادت بنایا ہے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں

اِس مایوسی اور محرومی کا شائبہ تک نہیں جو سپر اندازی اور پسپائی کا لازمی نتیجہ ہے۔

ادیبہ بزمی کی ان ہلکی پھلکی تحریروں میں، جو ہلکی پھلکی ہونے کے باوجود بے حد فکر انگیز بھی ہیں۔ لکھنے والوں کے لئے کئی سبق ہیں پہلا اور میرے نزدیک سب سے اہم سبق تو یہ ہے کہ اگر انسان اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو اسے زندگی میں قدم قدم پر کہانیاں چلتی پھرتی دکھائی دیں گی۔ دیکھنے والی نظر کے لئے ہر مشاہدہ ایک کہانی ہے، لیکن مشاہدے کی کوتاہی کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو مشاہدے اور تجربے کو کہانی نہیں بننے دیتی وہ چیز جرأت اور حوصلہ کی کمی ہے۔ دیکھنے والا سیدھے سادے مشاہدے میں چھپی ہوئی کہانی کی تہہ تک پہنچ بھی جائے تو اس کہانی کو دوسرے کے سامنے لاتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے کہ یہ معمولی سی بات کہنے پر، یا وہ صاف گوئی اختیار کرنے پر جس سے اس معمولی سی بات میں اثر اور دلکشی پیدا ہوتی ہے اس کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ ادیبہ بزمی نے اس اندیشے کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا، اور مشاہدے اور احساس کی مدد سے جو نتیجے اخذ کئے انھیں بڑی جرأت اور حوصلہ مندی سے تحریر کی شکل دے دی اور

جرأت اور حوصلہ مندی کی بدولت وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جو چھوٹی ہوتے ہوئے بھی نتیجہ خیز اور سبق آموز ہیں، ہمارے سامنے آگئیں۔ لکھنے والوں کے لئے ادیبہ بزمی کا سکھایا ہوا یہ دوسرا سبق ہے۔

ایک عادت جس کے ذکر سے میں نے یہ تعارف شروع کیا تھا اور جس سے ادیب کی تحریروں میں کشش اور دل آویزی پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ ہم حوادث کو حوادث سمجھنا چھوڑ دیں۔ یہ عادت پڑ جائے تو ہم اپنی محرومیوں اور مایوسیوں کو زندگی کے لوازم سمجھ کر آسانی سے قبول اور گوارا کر لیتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ہمیں زندگی کے ان لوازم کو معمولات سمجھنا اور ان پر ہنسنا آجاتا ہے۔ ادیبہ بزمی نے ادیب کو یہ حیات افروز سبق بھی سکھایا ہے، لیکن ایک اور سبق جس کی اہمیت کسی طرح بھی اس سبق سے کم نہیں یہ ہے کہ بات اچھے لفظوں میں کہی جائے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ادیبہ بزمی نے اس معاملہ میں رشید احمد صدیقی کے طرز کی پیروی کی ہے۔ وہ اپنی بات سیدھی سادی روزمرّہ کی زبان میں کہتی ہیں اور لفظوں کی معمولی سی الٹ پھیر سے روزمرّہ کو ادب عالیہ، سطح تک پہنچا دیتی ہیں۔ تحریر کی یہ خوبی ظاہر ہے کہ زورِ بازو سے پیدا نہیں ہوتی یہ ایک مخصوص ماحول میں پرورش پانے اور اس ماحول کے اثرات کو اپنے اندر جذب کرنے کا نتیجہ ہے۔

ادیبہ بزمی کے مضامین کا یہ مجموعہ مشاہدے کی دور رسی، احساس کے خلوص اور اظہار کی دیانت داری کا بڑا دلکش مظہر ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربوں کو صاف ستھرے، سلیس اور بے لوث انداز میں اس طرح ضبط تحریر میں لایا گیا ہے کہ پڑھنے والا انھیں پڑھ کر لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور غور و فکر کی طرف بھی مائل ہوتا ہے۔ تحریر میں اگر یہ دو خوبیاں پیدا ہو جائیں تو وہ قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی!۔

وقار عظیم

سمن آباد، لاہور
۴ مارچ ۱۹۷۱ء

# مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں

لکھنا لکھانا دردِ سر ہی تو ہے، اس لیے سوچا جب تک اس سے اپنی جان بچتی ہے بچاؤ۔ خوش نصیبی سے عورت اور وہ بھی مشرقی عورت ہونے کی وجہ سے، گھر گرہستی اور بچّوں کے چکر میں پھنس کر اپنی جان بخوبی بچی رہی اور طبیعت کو بڑی فرحت حاصل رہی کہ اور کچھ ہو نہ ہو، لکھنے لکھانے میں تو اپنے کو جان ہلکان کرنا نہیں پڑتی۔ البتّہ کچھ عرصے کے بعد جب سوچ بچار کی حس بیدار ہوئی اور ادھ گرد کا شعور پیدا ہوا تو کبھی کبھی بعض باتوں پر ذہن میں ایک کھٹک سی پیدا ہوتی اور جی چاہتا کہ کوئی تو اس موضوع پر بھی قلم اٹھائے مگر نہ جانے کیوں یہ موضوعات قابلِ توجہ نہ بن سکے ادھر خود

قلم پکڑنے کے خیال سے ہی وحشت ہوتی اور بات جہاں کی تہاں رہ جاتی۔ پھر کچھ وقت اور گزرا اور وہ باتیں جو کبھی کبھی ذہن میں کھٹک جایا کرتی تھیں، بھوت بن کر دماغ پر سوار ہو گئیں ادھر حادثات کے تھپیڑوں نے ان حالات کو جن کی تصویر ابھی تک ذہن میں صاف نہ تھی بالکل ہی کھول کر رکھ دیا۔ اب بہتیرا ذہن کو ادھر سے ہٹایا، بہتیرا ٹالا کہ دفع کرو، یہ خواہ مخواہ کا روگ کیوں جی کو لگاؤ، مگر وہ باتیں ذہن و دماغ سے نہ ٹلنا تھیں نہ ٹلیں۔ سوچا آخر کچھ نہ کچھ تو کیا ہی جائے پر سمجھ نے کچھ کام ہی نہ دیا نہ جی چاہتا تھا کہ ایک ہی بار ڈنڈا لے کر اٹھ کھڑی ہوں اور سارے معاشرے کو پل بھر میں دھنک کر رکھ دوں۔ خدا کا شکر ہے کہ جلد ہی یہ بات سمجھ شریف میں آگئی کہ اصلاح کا ڈنڈا لے کر گھومنا اپنے بس کی بات نہیں۔ اسی اُدھیڑ بن میں بہتیری تدبیریں سامنے آئیں۔ پر کوئی بات جی کو نہ لگی۔ جھک مار کر جب اور کچھ بن نہ پڑا تو مجبوراً قلم اٹھانا پڑا اور یہی سوچا کہ لکھو! لکھو! اور جی بھر کر لکھو۔ کہتے ہیں کہ بعض لوگ جب معاشرے سے بغاوت کرتے ہیں تو تشدد پر اتر آتے ہیں، بالکل اسی طرح جب میرا کچھ بس نہ چلا تو میں نے قلم سنبھال لیا۔

قلم نہ پکڑنے کی اس ضد اس ہٹ دھرمی میں عمر کا بہت بڑا

حصّہ گزر گیا۔ اب پیشتر اس کے کہ بقیہ زندگی بھی میرے ہاتھ سے نکل جائے میں ان سب باتوں کو سمیٹ لینے کے درپے ہوں جو میرے اردگرد بکھری پڑی ہیں، تاکہ اس مستقل خلش اور کسک سے تو نجات مل جائے جو میرے دل و دماغ کو مجروح کر رہی ہے۔

طنز و مزاح کا انداز اسی لیے مجھے بھا گیا ہے کہ اس میں دل کا غبار نکالنے کی بہت گنجائش موجود ہے اور یہاں تو دل میں غبار ہی نہیں بلکہ بگولے اُٹھ رہے ہیں۔

ادیبہ بزمی ——— لاہور

# میرا پرس

یہ اس پرس کی بات نہیں جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔
بلکہ میں تو آپ سے اُس پرس کی بات کر رہی ہوں جو گزشتہ دو سال
سے میرے پاس نہیں۔ مجھے وہ پرس اس لئے یاد آرہا ہے کہ میں
ویسا پرس پھر نہ خرید سکی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ
اس میں گنجائش بہت تھی اور میں اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اس میں
ٹھونس لیتی تھی۔ دواؤں کی شیشیاں۔ قلم۔ پنسل اور وہ خطوط جن کے
جواب دینے ہوتے۔ ضروری کاغذات اور ایک موٹی سی ڈائری جو
اپنی سادہ سی جلد کی وجہ سے مجھے بھا گئی تھی اس میں ہر وقت موجود
رہتی۔ پرس کی قیمت ۱۷/- روپے کے قریب تھی اور دکاندار کو قیمت

ادا کرتے وقت ہی میں نے اس کے گھٹیا پن کی کوفت دور کرنے کے لئے سوچا تھا کہ اگلی بار تو اتنے پیسے ہو ہی جائیں گے کہ میں ایک اچھا سا پرس خرید سکوں گی مگر جب اس پرس کے بخیے جگہ جگہ سے اُدھڑنے لگے اور میری ضروری چیزیں مع دو روپے چلنے آنے والے قلم اور اس رومال کے جو تولیہ۔ جھاڑن اور زانوپوش کا کام دیا کرتا تھا غائب ہو گئیں تو میں حیران کہ آخر میری اتنی قیمتی چیزیں غائب کہاں ہو جاتی ہیں۔ پر ایک دن جب میں بس میں بیٹھی ایک ہم سفر سے گپیں مار رہی تھی تو میری ڈائری نے شاید حبس دوام سے گھبرا کر بھاگ نکلنے کی ٹھانی اور میں نے اسے اس عالم میں پکڑا کہ آدھا دھڑ ادھر اور آدھا دھڑ اُدھر۔ اُف میری قیمتی اطلاعات۔ میں نے جلدی سے اس ناہنجار کو دبوچ لیا اور گھر آ کر سب سے پہلا کام یہی کیا کہ پرس کے اُدھڑے ہوئے حصوں کو پھر سے ٹانکے لگائے۔ خستگی کے سبب جہاں ٹانکے لگ ہی نہ سکتے تھے وہاں میں نے پن لگا کر گرنے والی اشیا کے راستے میں بند باندھے۔ یہ رفوگری کے ہنر بھی بمشکل چند ماہ کام آئے۔ اس دوران میں اکثر یوں بھی ہوتا رہا کہ بے دھیانی میں کوئی نہ کوئی پن احتجاجاً میری انگلی میں چبھ جاتا اور یاد دلاتا کہ پرس کی پنشن کا وقت آ گیا ہے۔ بارے جب اس کے ہر پہلو سے

میری کاریگری کے ہنر نمایاں ہونے لگے تو میں نے نیا پرس خریدنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا۔ اِدھر کچھ دنوں سے انگلیوں کے پوروں میں ان پنوں کے بار بار چبھنے سے دُکھن سی رہنے لگی تھی۔ غیر شعوری طور پر بٹوے کو چھونے سے گریز کی کیفیت پیدا ہو گئی جیسے بعض لوگ انجکشن سے خوف کھاتے ہیں۔

آخر اخراجات کی مدوں کا جائزہ لیا تو ایک اچھی تجویز ذہن میں آئی سوچا کہ اگر ہر مد سے پانچ پانچ روپے بچالئے جائیں تو پچیس روپے میں ایک اچھا پرس ہاتھ لگ سکتا ہے۔ مگر جن مدوں پر تخفیف کا کلہاڑا چلانا چاہا وہ پہلے ہی فریادی نظر آئیں یعنی نپی تلی۔

اب مزید انتظار کی گنجائش نہ تھی۔ آخر پرس اور تھیلی کے بین بین ایک چیز دو روپے کی خریدلی۔ یوں ایک قلم۔ ایک رومال اور چند پیسوں کا ایک ٹھکانہ بن گیا۔ اب رہے ڈائری اور اہم کاغذات تو میں نے چاہا تو یہی تھا کہ ایک موزوں شکل اور مناسب وضع کا چھوٹا سا لفافہ مل جاتا تو یہ چیزیں اس میں سلیقے سے رکھی جاسکتیں مگر مطلوبہ لفافہ دستیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ ایک ڈیڑھ فٹ لمبے لفافے میں کاغذات ڈال کر رکھنا پڑے۔ مگر ایک دوست کو میری یہ جدت بالکل نہ بھائی۔ اس نے جونہی مجھے بس اسٹاپ پر اس دھج میں دیکھا قریب آکر

میری متاعِ عزیز کو بے دردی سے گھسیٹا۔

"کیا ہے یہ ؟" ——— وہ چلّائی۔

اور میں ڈری کہ لفافہ کہیں اس کھینچا تانی میں چل ہی نہ بسے کم از کم میری بے مائگی کا راز سرِ بازار تو افشا نہ ہو۔

"ایک ایسا بیگ خرید لو نا!" ——— وہ نمونہ کے طور پر اپنا بیگ سامنے لائی۔

"ارے یہ کم بخت مصروفیت بازار جانا بھی ملے"۔ میں نے مصروفیت کی آڑ لے کر صاف جھوٹ بولا حالانکہ میں روزانہ اسی نیت سے بازار جاتی اور "چکر" لگا کر لوٹ آتی تھی۔

"فلاں بازار سے خریدنا سستا ملے گا" ——— وہ بڑے خلوص سے میری رہبری کر رہی تھی۔ "اور قیمت بھی معمولی ہے صرف دس روپے"۔

"واقعی! پھر تو اگلے مہینے ہی خرید سمجھو" ——— مارے مروت کے میں نیم راضی ہو ہی چلی تھی کہ ایک دم مجھے اپنے گھر کے "نہیں" کے بجٹ کا خیال آگیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے بروقت گمراہ ہونے سے بچا لیا۔

مجھے اپنی دوست پر غصہ آگیا۔ فضول خرچ کہیں کی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے بُرا بھلا کہا۔ اپنی تو عادتیں بگاڑ ہی چکی ہے اب

میرا ناس مارنا چاہتی ہے۔

میں اگر ایسے مشوروں پر عمل کرنے لگوں تو میرے گھر کے اس "نہیں" کے بجٹ کا دیوالہ نہ نکل جائے جسے میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اس مہنگائی کے دور کے لیے بنایا ہے۔ اور اس کی کامیابی کی بیّن دلیل یہی ہے کہ لوگوں میں میری سفید پوشی کا بھرم اب تک قائم ہے۔

اس "نہیں" کے بجٹ کی مختصر سی روداد ہے۔ میں نے بس یہی تو کیا کہ گھر کے اخراجات کی "گراں مدوں" کے بدلے نئے سستے اور سہل طریقے رائج کر دیئے۔ اس سلسلے میں چند مدوں کا تو بالکل ہی پتّا ہو گیا۔ مگر "ہر بنائے کہنہ" کے مصداق میں نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی۔ صبح کے ناشتہ میں انڈے، مکھن توس کو ختم کر کے پھلکے اور چائے کے استعمال کو رواج دیا اور گھر والوں سے کہہ دیا کہ جن کو چائے موافق نہ ہو یا پسند ہو وہ صرف روٹی پر اکتفا کریں۔ اس کے بعد انڈے۔ پھل دودھ اور گوشت جیسی مہنگی چیزوں کا گھر میں داخلہ بند کر دیا البتہ اتنی رعایت گھر والوں کی خاطر سے کرنی پڑی کہ ڈاکٹر کی سفارش پر قلیل تعداد اور مختصر مدت کے لیے یہ چیزیں صرف بیمار کی خاطر آسکیں گی۔ میری ان پابندیوں سے

بڑے تو بڑے بچے بھی اس قدر صبر و ضبط کے عادی ہو گئے ہیں کہ مجال ہے جو کبھی ان چیزوں کا ذکر بھی زبان پر لائیں اور جب چھوٹے بچے کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق صبح ایک انڈے کی خوراک دی جاتی ہے تو بقیہ دو تسلیم و رضا کے پتلے ادھر نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ تب مجھے اپنے بجٹ پر انتہائی فخر ہوتا ہے کہ اس کی بدولت بچوں میں احساس ذمّہ داری اور صبر و ضبط کا مادہ تو پیدا ہوا ورنہ اس زمانہ کے عام بچوں میں تو یہ باتیں اب ڈھونڈے نہیں ملتیں۔

میرے ماہوار بجٹ میں جن ضروری چیزوں کے حصول کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں انھیں حاصل کرنے کا ایک نادر طریقہ میں نے پچھلے دنوں ہی دریافت کیا۔ ہوا یوں کہ لکھنے پڑھنے کے لیے ایک لیمپ خریدنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دیوار میں لگے ہوئے بجلی کے بلب کی روشنی میں لیٹ کر پڑھنا دقّت طلب ہو گیا۔ پلنگ روشنی کے نیچے بچھایا لیکن صحیح زاویہ قائم نہ ہوا۔ کتاب ہاتھ میں لے کر لیٹتے وقت پتہ چلتا کہ روشنی تو کتاب کی پشت پر پڑ رہی ہے۔ اب جو میں پنجوں کے بل مخالف سمت میں کھسکنا شروع کرتی تو پلنگ کے نیچوں بیچ پہنچ کر روشنی کا زاویہ بدلتا مگر اس طرح کہ ہر ورق کی ابتدائی سطور پڑھنے کے بعد بقیہ سطور کو روشنی میں لانے

کے لیے کتاب کو دستِ دعا کی طرح بلند کرنا پڑتا۔ اس پر بھی ذرا ہاتھ تھکا اور کتاب سجدے میں گئی۔ ادھر لٹکے لٹکے ٹانگیں سُن ہو جاتیں۔ ادھر کتاب کو روشنی دکھاتے دکھاتے بات ہی دماغ سے نکل جاتی۔ سردی کے موسم میں مطالعے کے یہ لوازمات طبیعت پر گراں گزرنے لگے۔ تنگ آکر ایک لیمپ خریدنے کا ارادہ کیا۔

ایک صبح بازار جاکر تلاش شروع کی۔ تلاش کے بعد جو لیمپ پسند آیا۔ اس کی قیمت مبلغ چالیس روپے تھی مگر تھا لیمپ پوسٹ جس کی دھیمی دودھیا روشنی میں مطالعے کا برسوں سے ارمان تھا۔ گھر کے بجٹ میں چوں چرا کی مجال کہاں وہ تو پہلے ہی ٹھہرا "انہیں" کا بجٹ میں نے سوچا کہ خریداری نہ سہی دیکھ کر ہی جی خوش کر لیا کریں گے۔ لہٰذا پابندی سے بازار کے پھیرے شروع کر دیئے۔ اس بھلے دکاندار نے بھی اُسے ایسے زاویہ سے رکھ چھوڑا تھا کہ دُور سے ہی نظر آجاتا لہٰذا ادھر سے گزرتے ہوئے میں اسے ایک فرلانگ پرے سے دیکھنا شروع کر دیتی اور جب دکان قریب آجاتی تو نظر جھکا کر سامنے سے کچھ اس باوقار انداز سے گزرتی کہ دکاندار کو میری نظرِ بد پر شک تک نہ ہوتا ذرا آگے بڑھ کر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ دکاندار ادھر دیکھ تو نہیں رہا ہے میں اسے مڑ مڑ کر دیکھنا شروع

کر دیتی۔ یہ عمل ایک ڈیڑھ ماہ تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں لیمپ کی جزئیات میری نظروں میں اتنی سما گئیں کہ اسے دیکھے بغیر میں اس کی ایک ایک تفصیل بیان کر سکتی تھی۔ آخر اس دیکھ بھال کے نتیجہ میں وہ "بُعد" "ذہن" ہو کر رہا اُس وقت سے آج تک وہ لیمپ مجھے اپنے بستر کے قریب ہی رکھا نظر آتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس بجٹ کی بدولت میری بگڑی ہوئی عادتوں کی بڑی حد تک اصلاح ہو گئی۔ مدتوں سے یہ لت پڑی ہوئی تھی کہ کوئی کتاب جب تک خرید نہ لی جائے کوشش کے باوجود پڑھی نہ جا سکتی تھی۔ جب دیکھو کتابوں اور رسالوں پر پیسے ضائع ہو رہے ہیں۔ انتہا یہ تھی کہ بہت سے ضروری مطالبے تج کر بھی کتابیں خریدی اور پڑھی جاتیں اگر عین وقت پر اس بے راہروی کا تدارک نہ کیا جاتا تو اچھا خاصا گھر کتب خانہ بن کر رہ جاتا۔ ایسے موقعوں پر لوگ لائبریریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر مجھے یہ جھمیلے پسند نہیں لائبریری میں ایک انار صد بیمار کا معاملہ ہوتا ہے۔ جس کتاب یا رسالہ کو دیکھنا چاہو بروقت دستیاب نہیں ہوتی۔ اس آڑے وقت میں کتابوں کی دکانیں بڑی کام آئیں۔ جہاں کوئی نئی کتاب شائع ہوئی اور میں نے کسی بک سٹال کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر مطلوبہ کتاب کے ساتھ ساتھ

دوسری اور کتابیں بھی دیکھنے کے لئے مانگ لیں۔ اور سب کی ورق گردانی کر ڈالی۔ اس الٹ پلٹ میں کتاب پڑھی تو نہیں جا سکتی مگر اس کے مندرجات کا سرسری اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ چلتے چلتے سامنے بکھرے ہوئے رسالوں پر بھی ایک نظر ڈال لی تاکہ معلومات میں کمی نہ رہ جائے۔ غرض اس بھاگ دوڑ میں اتنا مواد ضرور ہاتھ لگ جاتا ہے کہ تادیر اوٹ پٹانگ حوالوں کے کام آتا رہتا ہے۔

باوجودیکہ اس کم خرچ کم خور اور کم پوش بجٹ میں کسی ہنگامے کسی چہل پہل کی گنجائش نہیں لیکن میں نے جشن منانے کی ایک ترکیب ڈھونڈ ہی نکالی ہے آپ اسے "جشنِ استقبال" کہہ لیجئے کیونکہ یہ ہمیشہ دوستوں کی متوقع آمد کے موقع پر منایا جاتا ہے۔ جونہی کسی دوست نے اپنی آمد کی اطلاع دی میں نے جشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایسے موقعوں پر میں گھر کا تفصیلی جائزہ لیتی ہوں چنانچہ بستروں کی اکلوتی چادریں تکئے کے غلاف۔ میز پوش اور دروازوں پر جھولتے ہوئے کثیف اور بوسیدہ پردے۔ جو ہفتوں پہلے سے مجھے اپنے جگر داغ داغ پر توجہ دلاتے رہتے ہیں اس روز توجہ پاتے ہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ بے تکلف دوستوں کے معاملہ میں اس "نام نہاد" مہمان خانہ سے بھی پردہ داری کا کام نہیں لیا جا سکتا جو مدّتوں سے یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔

دھیرے دھیرے کپڑوں کا ڈھیر لگنا شروع ہوتا ہے جو جلد ہی ایک عالیشان انبار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جب جشن منانے کے جملہ سامان فراہم ہو جاتے ہیں تو میں اپنے تینوں بچوں کو وضعداری اور سفید پوشی کا واسطہ دے کر کچھ اس طرح شیشے میں اتارتی ہوں کہ وہ بڑی خوش دلی سے اس کم خرچ بالا نشین قسم کے جشن میں شرکت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ طویل چادریں اور دبیز پردے برسوں کی کثافت سے پاک ہو کر میری نفاستِ طبع کا جیتا جاگتا نمونہ بن جاتے ہیں۔

مگر آنے والے عزیز دوست کی نظر میری سلیقہ مندی سے پہلے میرے چہرے پر پڑتی ہے۔ "خیریت بڑی تھکی ہوئی دکھائی دے رہی ہو؟"

"ہاں نہیں تو، آج کل دفتر میں بڑا کام ہے"۔ آخر مجھے جواب سوجھ ہی جاتا ہے۔ مگر اصلیت کو چھپانے کے لیے بے تکلفی سے قہقہے لگانے پڑتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ ادھر ادھر گھوم کر مستعدی اور پھرتی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ البتہ مہمان عزیز کے رخصت ہونے کے بعد جب جشن کا ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب ہنگامہ نزع یقیناً قریب ہے۔

آخر ایک دن جبکہ پرس خریدنے کا خیال میرے دماغ سے یکسر نکل چکا تھا اور میں اپنا عزیز ترین لفافہ اٹھائے بس اسٹاپ پر کھڑی بس کی آمد کی سُن گن لے رہی تھی۔ میری وہی پرانی دوست اچانک وہاں آن موجود ہوئی۔

"ارے اب تک نہیں خریدا پرس"۔ وہ بغیر کسی تمہید کے پھر پرس کے موضوع پر تھی۔ "جس دن ضروری کاغذات گم ہو گئے ساری کنجوسی اس دن دھری کی دھری رہ جائے گی۔

"کنجوسی" کا لفظ تیر کی طرح دل میں لگا۔ مگر صاف بات کو پی جانا پڑا۔

"دھیرے تو بولو" میں نے پاس کھڑے ہوئے مسافروں کی موجودگی سے خائف ہو کر التجا کی "بس اسی مہینے خرید لیں گے"۔

دوسرے دن دفتر میں تنخواہ ہاتھ میں لیتے ہی کچھ ایسا استغراق کا عالم طاری ہوا کہ اپنے حال کی سُدھ بدھ نہ رہی۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟ —— ہم سے تو بیس برس کے سوچ بچار کے بعد بھی یہ مسئلہ حل نہ ہوا"۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک رفیق کار شریکِ حال بنے کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے —— اور میں سوچ رہی تھی کہ واقعی کہیں میرے ضروری کاغذات گُم ہی نہ ہو جائیں۔

کیونکہ پرس خریدنے کی گنجائش تو ان پیسوں میں اِس مہینہ
بھی نہ تھی۔

# آپ کا تابعدار

خدا جانے آپ نے کبھی سرکاری ملازمت کی ہے یا نہیں اور اگر کی ہے تو درخواست میں یہ دو لفظ لکھتے وقت آپ کی جان پر کیا بیتی۔ تاہم اپنا دل تو ان دو لفظوں کے ہاتھوں ہمیشہ دو نیم رہا۔ سرکاری نوکری کے لئے پہلی درخواست میں جب یہ مشکل مقام آیا تو مجھ پر عجب ہونق پن کی کیفیت طاری ہو گئی اور میرا قلم چلتے چلتے رک کر رہ گیا۔

"ارے بھئی اب لکھ بھی چکو۔"

"کیا؟ لکھ تو دی وہ نامعقول درخواست۔"

"تو دستخط کیا تمہارے فرشتے کریں گے۔"

دستخط..... دستخط۔ میری زبان لڑکھڑا گئی اور میری نظروں میں "آپ کا تابعدار" جیسے..... ہیبت ناک الفاظ گھوم گئے جو میرے دستخطوں کے حرزِ جان بنے مجھ پر لرزہ طاری کر رہے تھے۔ دراصل اس لفظ کے ذہن میں آتے ہی میری نظروں میں ازمنۂ قدیم کے ان غلاموں کی تصویر ابھرنے لگتی جو شاہی احکامات کی تعمیل میں دو زانو، ہاتھ جوڑے، سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ یا اللہ! انسانی ضمیر و خودداری کو کچلنے کیلئے کیا کیا حربے استعمال کئے جا چکے ہیں۔ بہر حال انتہائی غمگین صورت بنا کر دستخط کا فریضہ ادا کیا۔ بس یہی احساس ہوا جیسے وہی غلامی کا جُوا میرے کاندھوں پر بھی رکھا جا چکا ہے۔

جب ایک روز نوکری مل جانے کا مژدہ ملا۔ اس وقت مارے خوشی کے یہ بات قطعاً ذہن سے نکل گئی کہ عاجزی و تحقیر کے کس تحت الثریٰ میں اتر کر یہ نام نہاد سرافرازی نصیب میں آئی ہے۔ تاہم دفتر پہنچ کر جب اور بہت سی مسکین صورتیں نظر آئیں تو اس تصور سے اپنا صدمہ کم ہوا کہ ع

یہاں کچھ مرے رازداں اور بھی ہیں

دس بارہ روز کے بعد خدا جانے کس ضرورت نے آن دبوچا کہ

مجھے چھٹی کی ضرورت پیش آ گئی۔ چھوٹی سی بات تو تھی ہی میں نے متعلقہ افسر کو زبانی چھٹی کی درخواست گزرانی۔

"ضرور..... ضرور لیجئے چھٹی! مگر ایک درخواست دے دیجئے"۔

"کس طرح؟" میں نے چاہا انجان بن کر جان چھوٹ جائے۔

"ارے بھئی! بس ایک روز کی چھٹی کی درخواست دے دیجئے بالکل ویسے ہی جیسے آپ نے ملازمت کی درخواست دی تھی"۔ انہوں نے میری دُکھتی رگ کو چھیڑا

میرا چہرہ ایک دم فق ہو گیا یعنی مجھے پھر اسی لغو مرحلے سے گزرنا پڑے گا لعنت ہے ایسی چھٹی پر۔ چلو ہم چھٹی ہی نہیں لیتے۔ اور میں نے اس ضروری کام کو کسی اور دن کے لئے ملتوی کر کے درخواست سے جان بچائی۔ ارے ہاں ایک تو شیرا وپر سے بکتر پہنے۔ ایک تو مجھے اس نامعقول ضابطہ کی تحریر سے ہی خدا واسطے کا بیر ہے جس کی ابتدا ہی اس قدر عجز سے کی جاتی ہے کہ بس ہاتھ جوڑنے اور پاؤں پڑنے کی کسر رہ جاتی ہے۔ کہ اوپر سے رہی سہی کسر اس تابعداری کے لفظ نے پوری کر دی۔ مجھ جیسے انسان پر باغی کے لفظ کا تو اطلاق ہو سکتا ہے مگر نہایت درجہ تابعدار ہوتے ہوئے خود کو تابعدار لکھنا اپنی ہی نہیں بلکہ ان لفظوں کی بھی توہین ہے۔

پر وہ جو کہتے ہیں کہ ان ہونی ہونی نہیں اور ہونی ہون ہار۔ ایک دفعہ بخار نے آدبایا۔ اب ہزار بستر سے اٹھ کر دفتر بھاگنے کی کوشش کی مگر بخار کی شدت سے وہ جان پر بنی ہوئی تھی۔ کہ بستر سے ہلا ہی نہ گیا۔ بہر حال دو تین دن میں بخار کی بلا تو ٹل گئی مگر بخار اپنے پیچھے جس بلا کو چھوڑ گیا وہ یہی درخواست کی مصیبت تھی کہ ٹلے نہ ٹلی۔ دفتر میں حاضر ہوتے ہی وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہ دو درخواست۔ یا اللہ! کیا مشکل ہے! کہیں ان نابجار لفظوں کی تکرار سے میں خود ہی اپنی نظروں سے نہ گر جاؤں۔ پر وہ بلا کہیں ٹلتی تھی۔ آخر یہی راہِ فرار نظر آئی کہ ایک صاحبزادے سے مری ہوئی آواز میں درخواست لکھنے کی درخواست کی۔ حکمت اس میں یہ پوشیدہ تھی کہ کم از کم اپنے قلم سے وہ نامعقول الفاظ تو نہ لکھنے پڑیں گے۔ صرف دستخط ہی کرنا ہوں گے۔

مگر صاحب نوکری اور وہ بھی سرکاری نوکری ہی کیا ہوئی کہ جس میں قدم قدم پر درخواست کا مرحلہ پیش نہ آئے۔ اب تو یہ معمول ہو گیا کہ دفتر میں قلم چاہیئے تو درخواست دو، کاغذ سیاہی یا پنوں کی ضرورت ہو تو درخواست دو، چندیا پر لٹکتی ہوئی روشنی کی ٹیوب خراب ہو جائے یا پنکھا حکم عدولی کرے تو بھی درخواست دو۔

کیسا کیسا بھنّاٹا نہ آتا۔ جی چاہتا کہ درخواست کی بجائے ایک ہی بار سر پھوڑ کر متعلقہ شخص کے سامنے رکھ دیا جائے کہ لو سب اپنی اگلی پچھلی درخواستیں۔ مگر اپنا بس بھی چلتا !۔ اور تو اور طرفہ ستم تو یہ تھا کہ وہ جو دفتروں میں ذرا ذرا سی بات پر کان پکڑی ہوتی ہے درخواست میں اس کی بھی وضاحت کرو کہ یہ لائق تعزیر جرم تم سے کیوں سرزد ہوا۔ اور شائستگی اور ضبط و تحمل کا پورا پورا مظاہرہ کرتے ہوئے جب سب کچھ رونا دھونا ہو جائے تو بڑے ادب سے نیچے تابعدار کے لفظ کا اضافہ کر کے عاجزی و بے چارگی کی انتہا کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھو۔ کیونکہ اس پر بھی وہ خطائے عظیم قابلِ معافی گردانی جائے تو اسے اپنی خوش بختی کی انتہا جانو !

پر جہاں اتنی ڈھیر سی باتیں اپنے سمجھنے کے لئے تھیں وہاں بیشتر باتیں ایسی بھی تھیں جن کا اپنی سمجھ آج تک احاطہ نہ کر سکی۔ مثال کے طور پر یہی کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لئے درخواست کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ضابطہ کی خانہ پُری منظور ہے تو متعلقہ شخص اسے اپنے رجسٹر میں درج کر کے اس پر ضرورت مند کے دستخط لے کر اس کی خطا معاف کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ درخواستوں کا ڈھیر تو رجسٹر میں نتھی ہونے سے رہا۔ پھر اگر ضرورت کی وہ چیز

درخواست دینے سے جلد میسر آجائے تب بھی صبر ہے۔ مگر یہاں تو یہ عالم ہے کہ ضرورت آج ہے تو اسے پورا اگلے مہینے کیا جاتا ہے۔ جو چیز مانگو وہ یا تو دفتری اسٹاک میں ملے گی ہی نہیں یا پھر یہ کہ عین ضرورت کے وقت متعلقہ انچارج صاحب غیر حاضر ہیں یا اپنی سیٹ پر تشریف نہیں رکھتے۔ یا بڑا کرم کیا تو یہ کہ صاحب اس وقت ہم بہت مصروف ہیں پھر کسی اور وقت مطلوبہ اشیاء بہم پہنچائی جائیں گی۔ اور جو ان کی مصروفیت کا جائزہ لو تو ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر سارا دن پھرکنی بنے رقص فرما رہے ہیں۔ بڑے ضابطے کا مظاہر کیا تو پرششِ احوال کے بہانے۔ کبھی کسی میز کے گرد چائے کے لئے منڈلا رہے ہیں تو کبھی کسی اور شخص کے پاس بیٹھے دفتری کینٹین کے سڑے بسے بدبودار بسکٹ بصد شوق نوش فرمائے جا رہے ہیں۔ گپیں ہو رہی ہیں، قہقہے اُڑ رہے ہیں یا حسب دستور اپنے پسندیدہ متعلق موضوعات پر گوہر افشانی فرما کر کچھ لوگوں کی تفریح طبع اور کچھ نفاست پسندوں کی طبیعت منغض کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔ پھر آہستہ بولنے یا دھیرے بات کرنے کی تو عادت ہی نہیں پائی۔ معلوماتِ عامہ کا ایک دفتر ہے کہ صلائے عام کی صدا کے ساتھ کھلا ہوا ہے۔ جس سے ہر شخص

حسب مقدور فیض یاب ہو رہا ہے ادھر مقرر ہے کہ شرافت اور شائستگی کی حدیں پھلانگ کر اپنے مخبوط الحواس ہونے کا ثبوت بہم پہنچا رہا ہے مگر بارہا یہی اندازہ ہوا کہ دیوانہ نہ صرف ہوشیار بلکہ بہت ہوشیار ہے۔ یعنی ساری خرافات تو اسے ازبر ہے لیکن نہیں یاد تو اسے اپنا کام اور اپنے فرائض کیونکہ اس کام کا تعلق تو دوسروں کی چھوٹی موٹی ضرورتوں سے ہوتا ہے اس لئے وہ تو انہی کے کلیجہ پر سانپ بن کر لوٹا کرتی ہیں۔ حاجت برآری کرنے والے کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ان کی بے وقوفانہ ضرورتوں پر توجہ دے کر اپنا دماغ فضول باتوں میں خراب کرے۔

ہرچند کہ مجھے درخواست گزرا نیدن کے اس شغل سے سخت نفرت ہے مگر اس کا ایک پہلو ایسا بھی ہے کہ جس کے لئے میرے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے کہ کاش اس ضمن میں بھی لوگوں کو درخواست دینا پڑتی اور وہ بھی اسی عاجزی اور انکساری کے ساتھ۔ وہ ہے "دفتر میں چپراسیوں سے کام کرانے کی مد"۔ سارا دن چپراسیوں کو کاغذ اٹھانے، لوگوں کے حلق میں پانی انڈیلنے اور جملہ چھوٹے موٹے کاموں کے ساتھ جب لوگوں کو اسے اپنے ذاتی کام کی غرض سے چلچلاتی دھوپ یا کڑکے کی سردی میں دوڑانے کے لئے انتہائی

عاجزی کے ساتھ درخواستوں کا طومار باندھنا پڑے اور آپ کا تابعدار لکھ کر اس سے ایک گلاس پانی کے لئے درخواست کرنی پڑے تو شاید غریب چپراسی کو کوڑی پھیرا کرنے کی اس مصیبت سے نجات مل جائے۔ ہو سکتا ہے کہ سخت پیاس کے عالم میں عجز و انکسار سے بھرپور ایک درخواست لکھنے کے مقابلہ میں وہ جھٹ اٹھ کر اپنی پیاس بجھانا منظور کر لیں اور وہ جو چار چار چھ چھ آدمی بیک وقت اس ایک جانِ ناتواں پر مسلط ہو کر مطالبات کی ایک طویل فہرست اس غریب کو سناتے رہتے ہیں اس سے اس جانِ حزیں کو نجات مل جائے۔

اس طرح شاید — اسّی روپے ماہوار پر پورے دفتر کی احکام برآری کرنیوالے میں کچھ عزور، کچھ فخر اور کچھ عزّتِ نفس تو پیدا ہو اور وہ بھی خود کو اس لائق سمجھے کہ جس کو درخواست پیش کرنے کی عزت بخشی جا سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کم تر درجہ کا سہی مگر ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے اگر اس کے فرائض کا تجزیہ کیا جائے تو ایک میز سے دوسری میز تک کاغذوں کا پشتارہ ادھر سے ادھر منتقل کرنا ہی کافی کام بن جاتا ہے۔ چہ جائے کہ ہر نام نہاد افسر کے معقول و نامعقول احکامات کی تعمیل جن کو اس کے فرائض

کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

ذرا تصور تو کیجئے اگر درخواستوں کا یہ طریقہ رائج کر دیا جائے تو صورتِ حال کیا ہوگی :۔

صبح دفتر کا وقت شروع ہوتے ہی مسمی جمیل چپراسی نے ایک ہانک لگائی کہ اب جن جن حضرات کو پانی پینا یا چائے منگانی ہو وہ ابھی سے اپنی اپنی درخواستیں تیار کر کے متعلقہ افسر کے توسط سے مجھے دے دیں۔

یہ وہی مسمی جمیل صاحب تھے جنہیں عام طور پر "اوئے جمیل" کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ اب جو ان کے نادر احکامات کانوں کے پردوں سے ٹکرائے تو پورے سیکشن کے کان کھڑے ہوئے۔

"کیا مطلب ؟" نعیم اسٹینو وضاحت کے طالب تھے۔

"بھئی مطلب اس کا یہ ہے"۔ جمیل صاحب نے وضاحت کے اس موقع کو غنیمت جانا۔ "آج آپ مجھ سے جس کام کو بھی کہیں گے اس کی درخواست لکھ کر دیں تب آپ کا کام ہو سکے گا۔ یاد ہے کہ کل ہی اس کا سرکلر ہوا ہے"۔

"ورنہ" نعیم اسٹینو صاحب بوکھلائے۔

"ورنہ" ظاہر ہے کہ درخواستوں پر نمبروار ہی غور ہوگا۔

بھائی ریاض بھائی ریاض ادھر تو آؤ" نعیم صاحب نے دہائی دی "دیکھو یہ سالا کیا بکواس کر رہا ہے"۔

"ارے یار کچھ نہیں بکنے دو" ریاض صاحب نے دو رہی سے جواب پکڑا دیا۔ وہ ہمیشہ سے کرسی پر بیٹھ کر اٹھنے کے قائل نہ تھے "سالے کا دماغ چل گیا ہے"۔

"اچھا!" جمیل چپراسی نے بات گرہ میں باندھ لی۔ وقت پر دیکھیں گے"۔

کچھ خرد مندوں نے ان مکالمات سے فائدہ اٹھایا۔ اور جلد از جلد ایک مشترکہ درخواست ٹائپ کر کے "بتوسط صیغۂ متعلقہ" جمیل صاحب کو پکڑا دی۔ "خوب پکڑے گئے"! مسمّی جمیل وہ مشترکہ درخواست دیکھتے ہی کھل اٹھے اور اسے سنبھال کر ایک طرف کو جا بیٹھے۔

سب سے پہلا آرڈر نواب دین صاحب کی ایک چائے کا تھا جس کے لئے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا۔ مگر صدائے برخاست بلکہ اب تو آٹھ بج کر چالیس منٹ پر افسر امام کیشیر کے لئے ڈکشنری اٹھا کر لانے کا وقت بھی گزر رہا تھا۔ دونوں حضرات نے جز بز ہو کر جمیل چپراسی کی جواب طلبی کی ٹھانی مگر ابھی اس جواب طلبی

کا نصف مضمون بھی تیار نہ ہوا تھا کہ مسمی جمیل نے ان دونوں کے ہاتھ میں جواب طلبی کا ایک ایک نوٹس لا تھمایا۔ دونوں حضرات اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکنے لگے اور کرتے بھی کیا۔ مسمی جمیل چپراسی برسوں سے دفتر میں ملازم تھے۔ لہٰذا انھیں دفتری قوانین اور ضابطے ازبر تھے۔ نکتہ یہ نکالا گیا کہ دونوں حضرات نے مشترکہ درخواست دے کر دفتری اصول و ضابطہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ لہٰذا آئندہ سے ایسی حرکتیں نہ کریں اور محتاط رہیں۔ اس تنبیہہ سے دونوں متعلقین جل بھن کر کباب ہو گئے۔ یعنی کام کروانا تو درکنار الٹا انھیں کے لینے کے دینے پڑ گئے۔

جمیل صاحب کے بگڑے تیور دیکھ کر سارے سست اور نکھٹو حضرات حرکت میں آگئے اور ہر کام کے لئے مسمی جمیل کا انتظار کرنے کی بجائے جلدی جلدی اٹھ کر اپنے اپنے کام کر ڈالے ۔

# داخلہ شروع ہے

بڑوں نے جب بھی کہا یہی کہا کہ اللہ اولاد دے تو لائق دے نہیں تو نالائق اولاد سے تو انسان اُوت بھلا۔" خدا جانے بڑوں کو اس لائق اولاد نے کیا نہال کر دیا تھا کہ وہ جب تک جیئے اولاد کی لیاقت ہی کے گُن گاتے رہے، خیر وہ جانیں ـــــ مبارک ہو انہیں اپنی لائق فائق اولاد ـــــ پر اپنے سے تو یہ اندھی تقلید ہو نہیں سکتی۔ میں تو کہوں گی اور بیچ کھیت کہوں گی کہ "اللہ اولاد دے تو نالائق دے ورنہ ایسی لائق اولاد سے تو انسان اُوت بھلا۔

لے کے جب تک بچے اسکول میں رہے مارے شرمندہ ہونے کے کچھ ہاتھ نہ آیا کہ بھئی بچے بڑے لائق ہیں بڑے ذہین ہیں۔

ارے ہوں گے۔ شرمندگی اٹھاتے اٹھاتے طبیعت تنگ آ گئی۔

پھر ہر چند ٹالا کہ دیکھو۔ دسویں کا امتحان اس مرتبہ نہ دو۔ بہتیرا ڈرایا کہ فیل ہو جاؤ گے باز آجاؤ۔ مگر وہ کہاں ماننے والے تھے ڈھیٹ بن کر ایک دم جو پڑھنے میں جٹے تو ٹکٹوں کی البم۔ قلمی دوستی اور کرکٹ میچ سب بھول بھال پڑھنے ہی کے ہو رہے۔ خیر میں نے بھی کہا بچو نیچ کر کہاں جاؤ گے ساری پڑھائی انگریزی میں ہے۔ پھر نہ کوئی ٹیوٹر، نہ کوئی مددگار۔ جھک مار کر آؤ گے اسی راہ پر۔ مگر انھیں تو اپنی لیاقت کا وہ زعم تھا کہ ایک نہ سنی اور امتحان دے کر ہی چھوڑا۔

خدا بچائے ایسے بے کہنے بچوں سے کیا مجال جو ذرا عقل سے کام لیں نہ یہ سوچا کہ اگر خدانخواستہ امتحان میں کامیاب ہو گئے تو کیا حشر ہو گا؟ آخر اپنے ملک میں تعلیم کا حق ہر ایرے غیرے کو تو حاصل نہیں۔ نہ یہ خیال کیا کہ اگر تعلیم کے فراق میں اُلٹی آنتیں گلے پڑیں اور لینے کے دینے پڑ گئے تو کیا ہو گا۔

میں تو شروع دن سے ہی ان کے کُند دماغوں پر یہ بات ٹھوکتی رہی کہ بچو دیکھو تم اس لکھنے پڑھنے کے چکر میں نہ پڑنا لکھنا پڑھنا دراصل ان حسرت کے ماروں کا کام ہے جن کے ماں باپ تعلیم یافتہ

نہیں ہوتے۔ اسی لئے تو یہ مثل ہے کہ اگر "پدر نتواند پسر تمام کند" تمہارا باپ خدا کے فضل سے یونیورسٹی کا فاضل تھا تمہیں کاہے کا ارمان چھٹا پڑتا ہے اور پھر یہ تو دیکھو کہ انہیں اس جان سوزی کا کیا صلہ ملا جو تم ان کے پیر تلے کی لیتے ہو۔ یہی نا کہ ساری زندگی جس صحافت کے لئے میٹ کر رکھ دی آج اس پیشہ میں کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا اور اگر کبھی ذکر آیا بھی تو چھٹ بھیّوں میں ہی شمار ہوگا۔ لہٰذا اولاد کو ہمیشہ اپنے بڑوں کے انجام سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اس لئے تم یہ دھندا چھوڑ دو وہ کام سیکھو جس میں چار پیسے کا فائدہ ہو۔ اور تیری میری خوشامد بھی نہ کرنی پڑے۔ ملک کو اس وقت صنعت کاروں کی سخت ضرورت ہے۔ اس موقع کو غنیمت جانو۔ کوئی فنی تربیت حاصل کرو۔ بڑھئی بنو۔ لوہار بنو۔ جو بہت ہی بڑا بننے کا شوق ہے تو مستری بن جاؤ۔ یہ ہاتھ کے ہنر ہیں جہاں بیٹھو گے چار پیسے کما کھاؤ گے۔

مگر افسوس کہ میری ایک نہ چلی اور ان ناسمجھوں نے دسویں کا امتحان دے ہی ڈالا۔

ادھر سے مایوس ہو کر میں نے خدائے بزرگ و برتر سے رجوع کیا۔ اور نہایت خشوع و خضوع سے رب العزت کی بارگاہ میں التجا کی کہ اے معبود تو ان نافرمان بچوں کو کیفر کردار تک پہنچا۔ خدایا تیری

رحمت سے کیا بعید ہے کہ بورڈ میں اب کی بار ان ہی بچّوں کے پرچے نالائق اور غبی بچوں کے پرچوں سے بدل جائیں اور ان کا مقدّر بھی ان فیل ہونے والے ذہین اور محنتی بچّوں کا سا ہو جن کی جان توڑ محنت پر ہر سال پانی پھرتا رہتا ہے۔ بلا سے کچھ بھی ہو بچّے داخلے کے جنجال میں تو نہ پھنسیں گے۔

شاید وہ قبولیت کا وقت نہ تھا یا خدا کو میری رسوائی منظور تھی۔ دعا قبول نہ ہوئی۔ میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بچّے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔

مہربانوں کو ایک بار پھر مجھے شرمندہ کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اپنا یہ حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، یہی فکر تھی کہ اب کیا ہوگا۔ کالج میں داخلے کی منزل کیسے سر ہوگی۔ مگر ان بے فکروں کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ جو کچھ کہو تو الٹا یارانِ طریقت بنانے پر تُل جاتے۔ ارے کچھ نہیں۔ بچوں کی فرسٹ ڈویژن ہے۔ اچھے سے اچھے کالج میں داخلہ مل جائے گا۔

میں نے اتمام حجت کی ٹھانی۔ بچوں کو آخری بار اونچ نیچ سمجھایا۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ تعلیم جاری رکھنے پر مصر تھے معلوم ہوا داخلے کے لئے شرطِ اول سفارش اور اس کے بعد صرف ان بچوں

کی شنوائی ہو سکتی ہے جنھوں نے دسویں میں سب سے زیادہ نمبر لیکر وظیفہ حاصل کیا ہو۔ صاحبزادی نے اتفاق سے وظیفہ حاصل کر لیا تھا اس لئے داخلے کی مستحق قرار دے دی گئیں۔ مگر صاحبزادہ بچارہ ایک تو وظیفہ حاصل نہ کرنے پر خود ہی شرمسار اور اوپر سے داخلے کے دھکے۔ دو ہی دن میں منہ اتر گیا۔ جب دیکھو گم سُم مورتی بنا بیٹھا ہے۔ اللہ! اسے کیا روگ لگ گیا! ۔ اچھا امتحان پاس کیا کہ بچّہ ہاتھوں سے ہی چلا۔ آخر پوچھا تو راز کھُلا کہ بغیر تگڑی سفارش کے اچھے کالج میں داخلہ ملنا ممکن نہیں۔ اونہہ! نہ سہی اچھا کالج میں نے معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا روہانسا ہو گیا۔

آخر مشکل کشائی کے لئے دوستوں اور مہربانوں کی فہرست پر نظر دوڑائی۔ ایک بھلی سی دوست مجسم سفارش بنی نظر آئیں۔ اسی کالج کی پرانی طالبہ تھیں۔ بس اور کیا چاہیئے ساری اصول پرستی بالائے طاق رکھ میں ان کے پاس جا پہنچی۔ مارے ضرورت کے یہ یاد ہی نہ رہا کہ میں بھی عام لوگوں کی طرح داخلے کی احمقانہ سفارش کے پیچھے بھاگ رہی ہوں مجھے تو اس وقت ایک ہی فکر تھی کہ دوست کی مروت سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں۔

بارے سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں داخلہ دلانے اور داخلہ

لینے کے شیدائی گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ بسوں اور تانگوں کی منزل سر کرنے کے بعد شام ڈھل چکی تھی اور منزل مراد سامنے تھی۔

میری سمجھدار دوست نے کالج کے مہتمم اعلیٰ کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کرنے سے پہلے صورت حال کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ دھوپ کے رُخ ایک اونچی چھت والے وحشت ناک کمرے میں جھانکنے پر ایک صورت نظر پڑی وہ ادھر لپکیں۔ نکیل پڑے اونٹوں کی طرح بقیہ قافلہ ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

"کیا حکم ہے" استاد معاملے کو بھانپ چکے تھے۔

"حکم کی تو مجال نہیں البتہ ایک درخواست ہے"۔ شاگرد نے انتہائی عاجزی دکھائی۔

مگر پیشتر اس کے کہ وہ حرفِ مطلب زبان پر لاتیں استاد نے تمہید باندھی اور ذاتی تجربات سے لے کر ہر واقف کار کے تجربے دُھرانے شروع کئے۔ اس راہ میں آنے والوں پر کیا گزرتی ہے، اس کو ایسے "رجزیہ" انداز میں بیان کیا تاکہ ہم اس "مبارزت طلبی" سے باز آجائیں۔ جب ہر وار خالی گیا تو کہنے لگے "روتے رہو، گاتے رہو، آتے رہو، چکر لگاتے رہو مطلب برآری کی اسی طرح کوئی صورت بن سکتی ہے"۔

"کیا واقعی اس طرح داخلہ ممکن ہے؟" میرے لہجے میں اشتیاق تھا۔
"یقیناً سب لوگ یہی کرتے ہیں"۔ وہ ازراہ خدا ترسی میری رہبری کر رہے تھے۔

لیکن جب میں نے رونے گانے اور چکر لگانے کے عملی پہلوؤں پر غور کیا تو مبلغ دو سو روپے کی وہ نوکری جو پورے دس سال کے دھکوں کے بعد میرے ہاتھ آئی تھی خطرے میں نظر آئی۔ عجب ششں و پنج کا عالم تھا نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

"آپ پرنسپل سے مل کر تو دیکھئے" انھوں نے پھر شوشہ چھوڑا۔

"وہ اس وقت مل سکیں گے"۔۔۔ امید بندھتی نظر آئی۔

"جی ہاں وہ اب تک یہاں تھے۔ ابھی ابھی ملاقاتیوں کے ڈر سے گھر کی طرف بھاگے ہیں"۔

میں منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے انہیں تک رہی تھی کہ مزید انکشاف ہوا۔

"ہر سال داخلے کے موسم میں کالج کے تمام پرنسپلوں کو گھر چھوڑ کر پہاڑ پر جانا پڑتا ہے۔ ورنہ داخلے کے خواہش مند ایک منٹ کو چین نہیں لینے دیتے۔ اب دیکھ لیجئے بیچارے پرنسپل صاحب کل ہی واپس آئے ہیں اور ملاقاتیوں نے انھیں تنگ کرنا شروع

کر دیا۔ حالانکہ داخلے کا معیار قائم کر دیا گیا ہے مگر لوگ ستانے سے باز نہیں آتے۔"

اس تفصیل کے بعد ہمت تو نہ پڑتی تھی مگر خانہ پری کے طور پر پرنسپل صاحب سے شرف ملاقات حاصل کیا وہ انتہائی مہربانی سے اپنی عزیز شاگرد کی دلجوئی کی خاطر فرزند ارجمند کو ان تمام مضامین میں داخلہ دینے کو تیار تھے جو اس کے انجینئری کے پروگرام سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ بالآخر وہی ہوا صاحبزادے پرنسپل صاحب کی اس فراخدلانہ پیش کش سے مستفید نہ ہو سکے۔

میں نے گھبرا کر اسے ایک اوسط درجے کے کالج میں داخل کر دیا اس کالج میں تعلیم تو خیر جیسی بھی تھی مگر تعلیم سے زیادہ نظم و ضبط پر توجہ دی جاتی۔ منتظمین کی نظر طالب علم سے زیادہ والدین کی جیب پر رہتی۔ زیادہ سے زیادہ فیسیں وصول کرنے کے بعد وہ نو عمر لڑکوں کی کوتاہیوں پر خاص نظر رکھتے تاکہ جرمانے کے بہانے والدین کی جیبیں ہلکی کی جائیں۔

بہرحال داخلے سے فراغت پا کر فرض شناس بڑوں کی طرح میں نے لڑکے کے مستقبل کے متعلق معلومات بہم پہنچانی شروع کیں۔ ہر خبر صاحبزادے کے کانوں میں ڈالی جاتی تھی۔ چنانچہ

اب میری گفتگو میں ٹیپ کا بند یہی ہوتا کہ برخوردار اگر انجینئر بننا چاہتے ہو تو بارھویں میں صرف فرسٹ ڈویژن لینا کافی نہیں اعلیٰ فرسٹ ڈویژن کے نمبر لاؤ۔ جوں جوں لڑکا ان وحشت ناک خبروں کو سنتا وہ پڑھائی میں جٹتا چلا جاتا آخرکار اس کا حلیہ بدلنا شروع ہوا۔ خون سوکھنے لگا۔ رنگت زرد پڑ گئی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن میں اپنے لخت جگر کی اس ہیئت کذائی سے نہایت مطمئن تھی۔ لڑکا کینچلی بدل رہا ہے۔ یقیناً اس کا دماغ بھی چلا پار ہا ہوگا۔

لیکن میری ساری خوش فہمی تو اس دن کافور ہوئی جب اس نے بتایا کہ علم الحساب خاک پلے نہیں پڑتا۔

"کیوں؟"

"کیوں کیا!" وہ اک دم پھٹ پڑا۔ ساری کلاس کا یہی حال ہے۔ اچھے اچھے ذہین لڑکے رو رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب سمجھانے کے تو قائل ہی نہیں۔"

آخر گیارھویں کا نتیجہ نکلا۔ کلاس کے آدھے سے زیادہ لڑکے فیل ہو گئے۔ باقی تھرڈ ڈویژن میں جوں توں پاس ہوئے انہی میں یہ صاحبزادے بھی تھے۔

نئے سال کے ساتھ داخلے کی ہنگامہ آرائی پھر شروع ہوئی۔

گیارھویں میں پاس ہونے والے تمام لڑکوں نے اچھے کالجوں میں داخلے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ میری بھی رگ حمیت پھڑکی میں پھر اسی کالج کے دروازے پر تھی۔ پچھلے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اب کی بار میں نے رونے گانے سے ہی تمہید باندھی۔ ایسی دردناک لَے اٹھائی کہ پتھر دل...... پانی ہو جائیں۔ پرنسپل صاحب جھرجھری لے اٹھے۔ لڑکے کو انٹرویو میں بھیجنے کا حکم ملا، زہے نصیب! بن گیا کام۔ دل نے کہا یہ سعادت تو صرف خوش نصیبوں کے ہی حصے میں آتی ہے۔ دفتر سے چھٹی لے کر بیٹے کو ساتھ لیا اور مختلف فارموں کی فراہمی کی بھاگ دوڑ شروع کر دی صاحبزادے کو ان دنوں بخار آرہا تھا مگر داخلے کا بھوت جو سر پر سوار ہوا تو سب بخار وخار رفوچکر ہو گیا۔ لگا پھرکنی کی طرح ناچنے۔ صبح سے بارہ بجے تک ایک کالج سے دوسرے کالج تک پچاسیوں پھیرے کر ڈالے۔

دو بجے انٹرویو تھا۔ پرنسپل صاحب مارے ہمدردی اور خوش اخلاقی کے توقع سے زیادہ تعاون پیش کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قواعد و ضوابط سے مجبور ہیں ورنہ ان کا بس چلے تو لڑکے کو ہاتھ پکڑ کر کالج کے اندر کر لیں۔

میں ان کے احسان تلے دبی جا رہی تھی۔ اللہ! ایسے فرشتہ صفت

لوگ دنیا میں اب بھی موجود ہیں۔

انٹرویو کے کمرے سے باہر ایک تنگ گلی میں تین چار گھنٹے مجرموں کی طرح کھڑا رہنا پڑا۔ مارے گرمی کے سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو گئے بصد مشکل بورڈ کے سامنے پیشی ہوئی۔ اطلاع ملی تین دن کے بعد قسمت کا حال معلوم ہو گا۔

لیکن قسمت کا نوشتہ خراب نکلا۔ کالج کے دروازے لڑکے پر بدستور بند تھے۔

معلوم ہوا سفارش کی کمی رہ گئی تھی۔

پرنسپل صاحب سے فریاد کی۔

کہنے لگے "کوئی بات نہیں آئندہ پر امید رکھیئے"۔

"آئندہ کیا ہو گا"

یہی کہ لڑکے کو اگلے سال بی۔اے میں ضرور داخلہ مل جائے گا۔"

"مگر لڑکا بی۔اے کرنا نہیں چاہتا انجنیئر بننا چاہتا ہے"۔

"تو یونہی سہی" وہ بڑی سادگی سے بولے "اس کے بعد یہ پروگرام بن سکتا ہے"۔

جناب حالات کا تقاضا ہے کہ لڑکا جلد از جلد اپنے پاؤں پر

کھڑا ہو"۔ میرا صبر جواب دے چکا تھا "ساری عمر پڑھانے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔"

"کوئی بات نہیں خدا پر نظر رکھئے۔ دو سال آنکھ جھپکتے میں یوں گزر جائیں گے" انھوں نے چٹکی بجا کر برسوں کو منٹوں میں تبدیل کر دیا۔

اس عبرت ناک انجام کے بعد بھی صاحبزادے بلند اقبال کے سر پہ انجینئر بننے کا بھوت سوار ہے۔ مگر مجھے پتہ ہے کہ وہ کبھی انجینئر نہیں بن سکتا۔ وہاں بھی سفارش کی کسر رہ جائے گی۔ لہٰذا میں آج کل ایک ایسے عامل کی تلاش میں ہوں جو لڑکے کے سر سے انجینئری کے جن کو اُتار دے۔

# ابوسعید بزمی

{طفیل صاحب! آپ نے مجھ سے بزمیؔ کی شخصیت کے متعلق لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ بزمیؔ کا نام ہی میری زندگی کا سب سے اہم باب ہے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اس کتاب کو ہی بند کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے بھی پچھلی زندگی کے متعلق سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی ہے۔ آج پانچ سال گذر جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں تو مجھے بھول ہی چکی ہیں پھر بھی سوچتی ہوں کہ بہت سی باتیں ایسی ضرور ہیں جن کی یاد ابھی تازہ ہے اور اگر اپنے جذبات سے قطع نظر انھیں کہہ دوں تو شاید مفید بھی ہوں۔ اس سلسلہ میں میری کوشش یہی ہے کہ بزمیؔ کو بحیثیت

انسان کے آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ لیکن میرے ذہن میں ان کی گھریلو زندگی کا کوئی پہلو اس طرح نہیں آتا کہ گھر سے باہر کی زندگی یا اس خاص قسم کی "ذہنی دنیا" سے ان کو الگ کر دوں جو ان کے لئے سب کچھ تھی اور جس کے لئے انھوں نے اپنے آپ کو بڑی ریاضت اور کوشش سے تیار کیا تھا۔}

ان کی موت پر مجھے عربی کی یہ ضرب المثل یاد آتی ہے۔ "ایک شخص تمام رات دعا مانگتا رہا کہ خدایا صبح کر دے اور جب صبح ہوئی تو اس کی بینائی زائل ہو گئی"۔

جب ارادے تکمیل کو نہ پہنچیں تو خواب پریشاں بن کر رہ جاتے ہیں۔ بزمیؔ کے بے شمار پریشان خوابوں کے دھندلے نقوش میرے ذہن میں باقی ہیں جنھیں اندھیروں سے کھینچ کر لانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی ترتیب سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے میں نے ان کی چند تصویروں کا سہارا لیا ہے کہ شاید یہ ذہن کی رہنمائی کر سکیں۔

لیجئے یہ تصویر بزمیؔ کی وہ واحد تصویر ہے جو نہ جانے کس اتفاق سے میرے پاس موجود ہے۔ بندۂ خدا نے اس مختصر سی زندگی پر ایک ستم یہ بھی کیا ہے کہ اپنی کبھی تصویر ہی نہ اُتروائی۔ ایک دن ان کی میز کے کاغذوں کے انبار میں سے پاسپورٹ سائز کی

تصویر کے دو پرنٹ برآمد ہوئے۔ میں بہت حیران ہوئی مگر وہ بولے "لیجئے کتنا پریشان کر ڈالا تھا تصویروں کے لئے اب کبھی مت کہئے کہ تصویر نہیں کھنچواتے"۔

اور میں مزید حیران ہو کر رہ گئی کہ کس قدر بے تکلفی سے بھوپالی دوستوں کی زبردستی کا احسان مجھ پر رکھ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ تصویر تو بھوپال اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کے ممبروں کے اصرار کا نتیجہ تھی۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ اس کانفرنس کے بانی اور وہاں کے عوام کے منظورِ نظر رہنما کی کم از کم تصویر ہی دفتر میں آویزاں ہو جائے۔ اور بزمیؔ کو برسوں تک یہ تامل رہا کہ اب کون تصویریں اترواتا پھرے۔

پھر آخری سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر کہنے لگے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک تصویر اترواؤں کہ خدا جانے کیا ہو...... مجھے عجیب سا وہم ہوا اور وہ تصویر نہیں اُتری۔ اب جب میرا وہم حقیقت بن کر سامنے آگیا تو میرے ہاتھ میں صرف یہی ایک تصویر رہ گئی۔ اس میں بزمیؔ کی گہری آنکھیں اور دونوں ابروؤں کے درمیان دو چھوٹی چھوٹی لکیریں جو سوچتے وقت اور نمایاں ہو جایا کرتی تھیں دکھائی دے رہی ہیں۔ جبڑے کی ساخت اور دہانے سے قوتِ ارادی کی مضبوطی ظاہر ہے۔ چوڑی پیشانی اور چہرے پر وہی شگفتگی ہے جو

مزے دار لطیفے بیان کرتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے وقت پیدا ہو جایا کرتی تھی ...... اور یہ لیجئے حسب دستور داڑھی بڑھی ہوئی ہے ـــــ شیو بنانے اور بال کٹانے کا کام ان کے لئے بے حد مشکل تھا۔ ہمیشہ دفتر سے اٹھتے ہوئے دس بجے رات کو اگر کسی بدقسمت کی دکان اس وقت بھی کھلی رہ جاتی تو اس میں داخل ہو جاتے اور وہ بھی دوستوں کی سرزنش سے تنگ آکر۔ سنا ہے کہ اسی خصوصیت کی وجہ سے مولانا عبدالمجید سالکؔ انھیں سردار جی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

نائی کی دکان سے چھٹکارا پا کر وہ یوں گھر آتے جیسے ساری دنیا کے جھگڑے چکا کر آئے ہوں۔ ایک دن بہت زوردار قہقہوں کے درمیان مجھے بتایا کہ کل جو میں بال بنوانے گیا تو شخص مذکور کہنے لگا کہ "بال پرانے فیشن کے بنا دوں یا اسی فیشن کے رہنے دوں"۔ یاد رہے کہ بڑے بال رکھنے کا فیشن ان دنوں نیا نیا شروع ہوا تھا جو نوعمر لڑکوں میں بہت مقبول تھا۔

شیو کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا نسخہ انھوں نے داڑھی کے نکلتے ہی معلوم کر لیا تھا۔ وہ یہ کہ شروع سے ہی داڑھی چھوڑ دی جائے۔ مگر دوستوں کی دستبرد سے وہ بچاری نہ بچ سکی۔ اس وقت سے مجبوراً شیو کرنے کی روایت قائم ہوئی۔

یہی حال لباس کے معاملے میں تھا۔ عجیب بے نیازی کا عالم تا عمر چھایا رہا۔ ان کی کھدّر پوشی میں کھدر کی سرپرستی کے ساتھ، لباس کے مسئلہ کو بھی ایک ہی بار حل کر دینا تھا۔ ایک دم کئی تھان کھدّر کے اٹھا لائے اور کرتے، پاجامے، شیروانیاں اور ٹوپی سب تیار ہو گئی۔ بعد میں درزی کو ہی یہ اختیار مل گیا کہ بھئی تو اپنی مرضی سے کپڑے بنا دیا کر۔ وہ ظالم ان کی ڈھیل سے روز بروز لاپروا ہوتا گیا اور سینے پرونے کے فن کے تمام تجربات کی وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ کیا کہیئے۔ ایک دن جو گھٹنوں تک لمبی قمیص سی کر لایا تو میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے کھدّر کے وہ سب کپڑے اٹھا کر پھینک دیئے۔

"بس آج سے کھدّر وِدّر سب بند، آئندہ سے انسانوں کے سے کپڑے بنیں گے۔"

"ارے بھئی جیسا اسے آتا ہے اس بیچارے نے سی دیئے ہیں۔ آپ کا جی چاہے تو آپ ٹھیک کر دیجئے۔" لیجئے جی چاہنے کا سوال آ گیا، گویا اگر جی نہ چاہے تو مت ٹھیک کرو۔ یہاں ایسے ہی پہننے میں کسے انکار ہے۔

پھر میں نے بڑے شوق سے عام رواج کے کپڑے تیار کروائے تو

نوان کو بھی انھوں نے ایسی بے نیازی سے پہن لیا جیسے بچھلے درزی کے سلے ہوئے ملبے کرتوں کو۔ البتہ جدید وضع کے لباس میں اتنی ترمیم کردی کہ کوٹ کے بجائے شیروانیاں سلوائیں۔

گنگا جمنا کے دوآبہ میں شروانی وضع داری اور شرافت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ جو لوگ یوپی کے قدیم خاندانوں کی خصوصیات سے واقف ہیں وہ اس بات کی تائید کریں گے کہ ان لوگوں کے لباس ہی میں نہیں چال ڈھال، اٹھنے بیٹھنے اور روزمرہ کی زندگی کے طور طریقوں میں ایک رکھ رکھاؤ ایک دھیماپن ایک صبر و سکون کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ یہ صبر و سکون جسے اکثر بڑے ریاض سے حاصل کیا جاتا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک ان لوگوں کی خصوصیات تھیں، جو قومی زندگی میں اہم خدمات انجام دے گئے اور بعد میں مولوی کے لقب سے یاد کئے گئے۔ بزمی کا خاندان بھی ایسے ہی مولویوں کا خاندان ہے، جن کے ہاں اونچی آواز سے بولنا منع ہے، ریشمی کپڑے پہننا بُرا ہے، زمین پر زور سے قدم رکھنا بُرا ہے، غرض یوں جینا کہ ع

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

بزمی کو بہت سی باتیں اپنے ماحول سے ورثہ میں ملیں اور کچھ

انھوں نے اپنالیں ان کی طبعیت میں ایک دلآویز قسم کی یکسانیت تھی، ایک ٹھہراؤ تھا۔ سُنا ہے کہ اس ٹھہراؤ اور پختگی عمل کو بھوپال کے حکمران کی چیرہ دستیاں اور ریاستی جیل کی ہولناک کوٹھری بھی متزلزل نہ کر سکی۔

شدید سے شدید جذباتی موقع پر بھی وہ ایسے ہی پرسکون رہتے اور انتہائی غصہ میں بھی آہستہ سے ایک آدھ جملہ سنائی دیتا۔ چہرہ کے اتار چڑھاؤ یا آنکھوں کی چمک کے سوا اور کسی طرح یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا کہ یہ شُستہ اور مہذب جملے کس جذبہ کے تحت کہے گئے ہیں۔ بشتر ان کے غصے کی حالت کچھ یوں ہوتی۔

"کیا گڑبڑ ہے یہ؟ کیوں اتنا شور مچا رکھا ہے؟"۔ وہ کاغذ پر سے نظریں اٹھائے بغیر لکھتے لکھتے بولتے جاتے، گھر میں بہرحال کسی نہ کسی وقت کوئی ہنگامہ ہوتا ہی ہے اور مجھے اکثر کسی وجہ سے ان کے لکھنے میں مخل ہونا پڑتا۔

ان کا اعتراض سُن کر میں بھی جھلّا جاتی۔ "جی ہاں ٹھیک ہے، بے خبری میں ہر بات ہی ہنگامہ معلوم ہوتی ہے۔"

اس کا جواب عموماً یہ ہوتا کہ اپنا کاغذوں کا پُشتارہ اٹھایا اور کسی دوسرے کمرے میں گھُس کر کھٹ سے دروازہ بند۔

ابھی ان کی بے نیازی پر میری طبعیت کا تکدّر باقی ہوتا کہ وہ بچّوں کی سی معصومیت سے اپنا تازہ شاہکار سنانے آموجود ہوتے۔ ایک مضمون نگار اپنے مضمون کی تکمیل پر جس طرح خوشی کا مجسمہ بن جاتا ہے اور مسرّت کی جو روشنی اس میں نظر آتی ہے، اس کا ساتھ نہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی ناراضگی جلد ہی ختم کر دینی پڑتی۔

تاہم ایسی لڑائی کے موقعے بھی ہماری اس سات سالہ زندگی میں بہت کم آئے۔ کیونکہ بزمی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی جن پر عام طور پر گھروں میں فساد برپا ہوتا ہے۔ گھر میں کیا ہوتا ہے؟ کیسا کھانا پکتا ہے؟ خرچ کس طرح سے ہوتا ہے؟ کون نیا ملازم رکھا جاتا ہے؟ انھیں کچھ غرض نہ تھی۔

انھیں تو یہ مسرّت ہی کافی تھی کہ گھر کی بدولت انھیں زندگی کا سکون و اطمینان تو میسر ہے —— کیا یہ خوشی ان کے لئے کافی نہ تھی کہ وہ جس وقت چاہیں کتابیں پڑھ سکتے ہیں انھیں مطالعہ کے لئے بھوپال کے قدیم کھنڈرات اور ویران سڑکوں پر تو پناہ نہیں لینی پڑتی تاکہ وہ والد کی سخت گیری کی زد میں نہ آسکیں۔

ان کو اپنے بچپن کے بے شمار دکھ یاد تھے۔ اُس وقت کے

جب زبان کو اظہار پر قدرت نہ تھی مگر دل دکھی احساسات کا خزانہ بن گیا تھا۔ بچپن میں انھیں پرندوں سے بے انتہا محبت تھی۔ مگر وہاں گھر میں پرندے کہاں، جہاں سوتیلی ماں کے نخروں کا راج ہو۔ ایک کتاب کہیں سے ہاتھ لگ گئی تھی جس میں پرندوں کی تصویریں تھیں تو ڈرے اور سہمے ہوئے ابوسعید نے جو ابھی بزمیؔ نہ بنا تھا۔ گھر کے کونوں کھدروں میں، الماریوں کے پیچھے اور جہازی چھپر کھٹ کے نیچے، اندھیروں میں چھپ چھپ کر ویسی ہی تصویریں بنانے کی مشق شروع کر دی اور ایک ایک تصویر نقل کر کے چھوڑی، لیکن پھر والد صاحب کو پتہ چل گیا۔ گھر میں کیونکہ شرع کی رو سے کوئی تصویر رکھنا حرام ہے اس لئے اصل اور اس کی نقل دونوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ بزمیؔ کو یہ سانحہ بڑی جزوی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھا۔ اس لئے یہ ان کے لئے بڑے سکون کا باعث تھا کہ ان کے اپنے بنائے ہوئے گھر میں بچے اپنی مرضی سے کتابیں پڑھ سکیں گے۔ کھیل، کھیل سکیں گے، آزادی سے ہنس سکیں گے اور یوں وہ اپنے سارے تشنہ ارمان پورے کر سکیں گے۔

اپنی عدیم الفرصت زندگی میں بھی وہ جب اپنے چار پانچ سالہ بیٹے کو سلیٹ پر کیل کانٹے بناتے دیکھتے تو اسے اپنے پاس بلا لیتے۔

"آؤ منے چڑیا بنائیں! کیا بنائیں؟ کبوتر بنائیں کبوتر؟"

پھر بڑے انہماک سے کبوتر بنایا جاتا اور دونوں باپ بیٹے بے انتہا خوش ہوتے۔ شاید اپنی کامیاب تصویر سے زیادہ اپنے بچپن کی تمنا کو پورا کرنے پر خوش ہوتے۔

پھر یہیں تک بس نہ تھا۔ ایک دن دس پندرہ شیرازی کبوتر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔

"ارے یہ کیا تماشہ ہے؟"

"ہنہ! تماشہ کہہ دیا، بڑی مشکل سے خرید کر لایا ہوں"۔

"بلی جو کھا جائے گی"۔

"نہیں کھائے گی، ہم خود دانہ پانی ڈالا کریں گے، ہم تو بچوں کے لئے لائے ہیں"۔

آخر بڑے اہتمام سے کوٹھی منگوائی گئی اور چنوں کا دانہ بچے سارا دن بکھیرتے رہتے اور کبوتروں میں گھسے رہتے۔ اس وقت صحن میں سے گزرتے ہوئے وہ اس خوب صورت منظر کو ایسی محبت سے دیکھتے جیسے کبوتروں کے سڈول اور پاکیزہ وجود میں ان کے آئیڈیل کا کوئی اہم راز چھپا ہو۔

بزمی کو مطالعہ کا بچپن سے شوق تھا۔ پانچ سال کی عمر میں والدہ

کے انتقال کے بعد سے چودہ پندرہ سال کی عمر کا عرصہ جو انہوں نے اپنے نانا کی حویلی میں گزارا۔ مطالعہ کے یادگار دن تھے۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق صاحب سابقہ ریاست بھوپال میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے اور ایک وسیع کتب خانہ کے مالک تھے۔ انھوں نے بڑے شوق سے بزمی کو فارسی اور عربی پڑھائی کیونکہ ان کے کھینچے ہوئے زائچہ کے مطابق یہ لڑکا بڑی علمی صلاحیتوں کا مالک بننے والا تھا۔ اس پُراسرار قدیم حویلی کے حجروں میں جہاں زندگی بہت احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ چلتی تھی دونوں نانا نواسے ان خزانوں کو کُریدا کرتے تھے جن کے جواہر روز بروز مٹی کے مول ہو رہے تھے۔

پھر جب نانا کے انتقال کے بعد اس حویلی کا سکون بھی عُنقا ہو گیا اور اس کی بنیادیں لُون لگ کر جھڑنے لگیں تو بزمی نے غلام گردش کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری کو اپنا لیا۔ کیونکہ نانا کے وارثوں کے لئے ان علمی خزانوں اور تاریک حجروں سے زیادہ اہم چیزیں موجود تھیں۔

انھوں نے ایک بار مجھے بتایا کہ "میں حجرے کے دروازے میں لیٹ کر کتابیں پڑھا کرتا تھا کیونکہ اس کے آگے ایک اور حجرہ تھا اور اس میں سے ہو کر ذرا سی روشنی میرے حجرے کے دروازے تک آیا کرتی

تھی۔"

آخر وہ حویلی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور وہ کتابیں بک کر رہیں تو بھوپال کے کھنڈرات نے اپنی آغوش کھول دی جن سے رفاقت کی مدت غالباً نو دس سال رہی۔ یہیں سے بزمی نے بھوپال کے مقامی اخبارات کے لئے مضمون لکھنے شروع کئے۔ جس کی اشاعت والد کی سخت ناراضگی کا باعث بنی اور یہیں سے منشی فاضل کے امتحان کی تیاری ہوئی جس کے لئے اس بنا پر جھڑکیاں دی گئیں کہ اتنی چھوٹی عمر میں چلا ہے امتحان دینے — !

بے چارے والد چند ہی سال بعد اس لڑکے کو جسے وہ منشی فاضل کے امتحان کے ناقابل سمجھتے تھے، دو بھائیوں اور ایک ماں کا سہارا بنا کر چھوڑ گئے۔ سولہ برس کی عمر تھی کہ ملازمت کا چکّر شروع ہوگیا۔ میٹرک کی سند سے لے کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ) تک کے سب مرحلے اسی طرح طے ہوئے۔

اخبار "مدینہ" سے تعلق کے دوران، چوبیس سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک، جب میرا ان کا ساتھ ہوا، وہ اگرچہ معاشی لحاظ سے آسودہ تھے مگر بنیک بیلنس کچھ نہ تھا۔ کیونکہ آمدنی سے یا تو موٹی موٹی کتابیں خریدی گئیں۔ یا "اسٹیٹ پیپلز کانفرنس" کے چندے دیئے گئے

اُن کے بنائے ہوئے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ غالبؔ و اقبالؔ کے کلام سے لے کر فسانۂ آزاد کی ضخیم جلدوں تک، انگریزی کے منتخب افسانوں سے لے کر معاشیات کی ٹھوس کتابوں تک، اور قرآن اور بائبل کے مقدس نسخوں سے لیکر کارل مارکس کی کیپیٹل (Capital.) تک کے مجموعے ان کے پاس موجود تھے۔ انہیں کتابوں میں وہ آکسفورڈ ڈکشنری بھی تھی جسے وُہ اپنی اوائل عمری کی نوکری میں دفتر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ تاکہ خالی اوقات میں —— پرانی فائلیں پڑھنے میں مدد دے سکے۔ اور یہ مدد میرے خیال میں بڑی مہنگی تھی۔ کیونکہ اس وقت ہر لفظ اُن کے لئے ڈکشنری طلب ہوا کرتا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد جب امریکہ سے ان کا سامان آیا تو دوسری اشیائ تو ہمیشہ کی طرح غائب ہو چکی تھیں البتہ ان کی پسندیدہ کتابیں ضرور مل گیئں جو شاید بیکار سمجھ کر نظر انداز کردی گئی تھیں اس لئے محفوظ رہ گیئں۔

ان کا کتابیں رکھنے کا طریقہ بھی کچھ نیا ہی تھا۔ کچھ کھُلی، کچھ اَدھ کھُلی کچھ کے بیچ میں کاغذ ٹھُنسے ہوئے اور بعض ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی ہوئیں۔ ایک میدانِ حشر تھا جس کے لئے عام سائز کی میز کو مختصر سمجھ کر ایک بہت بڑی میز لی گئی تھی،

اس طرح سے انھیں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آتا تھا کہ ہر چیز ہاتھ ڈالتے ہی مل جاتی ہے اور ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا۔ ان کا قول تھا "جو لوگ کتابیں سجا سجا کر رکھتے ہیں وہ انھیں پڑھتے نہیں" بعد میں جب تمام کتابیں الماریوں میں چُن دی گئیں تو انھیں شکوہ پیدا ہو گیا کہ ان کی تمام چیزیں میں نے کھو دی ہیں اس لئے ان کی ضرورت کی کتابیں مجھے ہی ہمیشہ ڈھونڈ کر نکالنی پڑتی تھیں۔ لیکن اخبار کے سلسلہ میں معاملہ برعکس تھا اگر کوئی ان سے پہلے اخبار دیکھ کر اس کے صفحات آگے پیچھے کر دیتا تو برہمی کا یہ جملہ اکثر سنائی دیتا:

"تمام اخبار باسی کر دیا اسے، ساری تہہ خراب ہو گئی"۔ پتہ چلتا کہ اس بات پر بہت ناراض ہیں۔

خوشبو دار لطیف قسم کی چائے پی کر، دھیمے دھیمے انداز میں باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس وقت سیاست سے لے کر اپنی زندگی کے آئندہ پروگراموں پر غور ہوتا۔ ابوالکلام آزاد کی شخصیت ان کو بہت پسند تھی۔ اس لئے وہ اکثر ان کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ، غدر کے دور میں انگریزی استبداد سے ٹکر لینے والے مجاہدوں کی داستانیں اور ان تمام بہادروں کے کارنامے جو غدر کے بعد سے آزادی کے دور تک انگریز کے مظالم

سے ٹکرا کر اپنی جان پر کھیل گئے تھے۔ ایسے اور بہت سے محب وطن لوگوں کی داستانیں انھیں ازبر تھیں۔

انھیں غدر کی سو سالہ برسی منانے کی بڑی تمنّا تھی۔ "مجھے ۱۹۵۷ء کا بڑا انتظار ہے۔" وہ بڑی دلسوزی سے کہتے۔ "ہم غدر کی سو سالہ برسی بڑے دھوم سے منائیں گے۔"

اب جیسے جیسے ۱۹۵۷ء قریب آتا جاتا ہے مجھے ان کے جملے بار بار یاد آتے ہیں کیونکہ ۱۹۵۷ء میں تو خود ان کی چپ چاپ گذرنے والی برسیوں کو چھ سال بیت چکے ہوں گے۔

وہ کوئی انسان تھا "بلیّات" تھا پورا "بلیّات"۔ "بلیّات" کا لفظ ان کی لغت میں بہت وسیع مفہوم رکھتا تھا۔ غصہ ہو تو "بلیّات" پسندیدگی ہو تو "بلیّات" کوئی فریب دے جائے تو "بلیّات" اگر احترام و عقیدت منظور ہو تو گویا بہت ہی "بلیّات" ان بہت ہی "بلیّات" قسم کے لوگوں نے ان کے ذہن کا بہت بڑا حصہ گھیر رکھا تھا۔ جو لوگ کچھ بھی نہ ہوتے ان میں بھی وہ عظمت کے پہلو ڈھونڈ لیتے۔ اور گھر آ کر اطلاع دیتے کہ "میں تو اسے یونہی سا آدمی سمجھتا تھا مگر وہ تو پورا بلیّات نکلا۔"

ایک دن ایک لالہ جی کا قصہ سُنا رہے تھے جو کہیں اتفاق سے

کانگریس کی سیاسی تحریک کے سلسلہ میں دس پندرہ دن جیل میں کاٹ آئے تھے اور اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے تھے کہ میں نے اُکتا کر بات کا رخ بدل دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ بھوپال جیل کی جن کوٹھڑیوں میں بزمیؔ نے ڈھائی سال رہ کر اپنی صحت برباد کی وہ کلکتہ کے "بلیک ہول" سے بدتر تھیں وہاں سانپ، بچھو اور حشرات الارض قیدیوں کی ہم نشینی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ریاستی جیلوں میں کسی درجہ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا وہی عام قیدیوں کی بارکیں جہاں نہ روشنی تھی نہ کھلی ہوا، اور گرمیوں کی راتوں میں جب تپتی ہوئی پتھر کی کوٹھڑیوں میں ان قیدیوں کو بند کر دیا جاتا تھا تو باہر کی ٹھنڈی ہوا ان پتھروں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ جاتی۔ یہ وہی لوگ تھے جو عوام کے لئے روٹی، کپڑا، ہسپتال اور اسکول مانگتے تھے۔

میں نے کہا "بزمیؔ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں بہت سے عظیم انسان ہیں۔ بہت سے جینئس ہیں مگر آپ بھی۔۔۔۔"

"ہم نے کیا ہی کیا ہے"۔ بزمیؔ نے تاسف کے انداز میں جواب دیا۔

(۱۹۵۶ء میں "نقوش" کے
شخصیات نمبر کے لئے لکھا گیا)

# معذرت کے بغیر

اب جناب یہ وہ زمانہ تو ہے نہیں مولانا بدرالدین احمد اور حامد احمد دہلوی جیسے سٹھیائے ہوئے لوگوں کا جو بزعم خود ادیب اور ادب کے ٹھیکیدار بن بیٹھے تھے۔ اوپر سے ان کے ہتھے چڑھ گئے دو عدد رسالے، بس اب کیا تھا ان دو حقیر فقیر رسالوں کے ذریعہ ملک میں یوں سٹاسٹ ادیب بننے اور پیدا ہونے لگے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کارخانہ کھل گیا ہے۔ ذرا کسی شخص میں صلاحیت دیکھی اور دونوں اس پر داری صدقے ہوئے جا رہے ہیں۔ تعریفیں کرتے کرتے منہ سوکھ رہا ہے۔ اور جان نہ پہچان خطوط کے ذریعے ہی ہمت افزائیاں ہو رہی ہیں۔ اپنی کم فہمی کے باعث ہر ایک کے سر پر دستِ شفقت

رکھ کر "ہل من مزید" کے تقاضے کئے جا رہے ہیں۔ گویا رسالے نہیں دوزخ ہیں کہ مضامین پر مضامین ڈالے جا رہے ہیں اور ان کم بختوں کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ آگ دہک رہی ہے اور تقاضے جاری ہیں۔ ادھر کسی نے انھیں اپنی تازہ تخلیق بھیجی ادھر انھوں نے اسے شعلوں کی نذر کر کے جگمگا دیا۔

نتیجہ وہی ہوا جو ایسی ناعاقبت اندیشیوں کا ہونا چاہیئے تھا یعنی یہ کہ افسانہ نگاروں، نقادوں، مضمون نویسوں اور نظم و غزل نگاروں کی وہ کھیپ کی کھیپ تیار ہوئی کہ اچھا خاصا فوج کا ایک دستہ بن گیا۔ وہ تو اردو ادب کی قسمت ہی اچھی تھی کہ جو بھی ان کم فہموں کے ہتھے چڑھا کندن بن کر نکلا۔ اور اپنی کم عمری کے باوصف ادب کی پہلی صفوں میں اپنی جگہ بنا گیا۔ ورنہ ان لوگوں نے اپنی غلط بخشیوں کے طفیل قومی ادب کو تہ تیغ کرنے میں کوئی کسر تو اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان ناعاقبت اندیشوں کو تاعمر یہ افسوس بھی رہا کہ کسی لکھنے والے کو کچھ معاوضہ ہی نہ دے سکے اور دیتے بھی کہاں سے گرہ میں تھا ہی کیا جو دیتے ورنہ ان کا بس چلتا تو رقم تو الگ رہی اپنی بوٹیاں تک کاٹ کر لکھنے والوں پر سے نچھاور کر دیتے۔ طرفہ ستم تو یہ تھا کہ مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر سب کے ساتھ یکساں برتاؤ سب کے ساتھ یکساں

طرزِ عمل، سب کے ساتھ وہی ایک وطیرہ، اور تو اور اس مروّت میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ لکھنے والا مرد ہے یا عورت اور یوں جناب ایک محترمہ بڑے طمطراق سے میدان میں آڈٹیں۔ اور ایسی جمیں کہ ٹلنے کا نام ہی نہ لیا۔ مردوں کو تو خیر، یوں کہو کہ اپنے ہی ہم جنس تھے اس لئے ان سے کوئی مطالبہ معقول صورت اختیار نہ کر سکا۔ لیکن عورت تو بہرحال وہی صنف ہے جو ہماری ساری شاعری کی جان ہے۔ ہرچند کہ محترمہ سخت مرکھنی اور معاملاتِ قلب و نظر میں کوری واقع ہوئی تھیں مگر یوں صاف بچ کر تو جانے نہ پاتیں۔

بہرحال گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط۔ خدا خدا کر کے ان خبطی بڈھوں سے جان چھوٹی اور میدان خردمندوں کے ہاتھ آیا۔ معاملہ خالص ادب کا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر خرِ نا مشخّص ادیب نہیں بن سکتا۔ لہٰذا بڑے سوچ بچار کے بعد طے کیا گیا کہ تمام چور دروازے بند اور اہم مقامات کی کڑی ناکہ بندی کر دی جائے تاکہ لوگ بغیر اجازت نامے کے ادب کے میدان میں در نہ آئیں۔ اجازت نامہ عطا کرنے کا کام ان لوگوں کے سپرد کیا گیا جو رسالوں کے مدیر ہوں یا بیک وقت مدیر اور پبلشر دونوں ہوں۔ دراصل ناکہ بندی کے ذیل میں یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ نشر و اشاعت کے ہر ذریعے پر قابو پا کر ہی ادب کی پوری طرح

پر چوکسی ہو سکے گی۔ موجودہ دانشوروں نے پچھلے ادیبوں کی تیار کردہ فوج کو دیکھ کر بھانپ لیا تھا کہ اگر ادیبوں کے اس بڑھتے ہوئے ریلے کو روکا نہ گیا تو ان کی تعداد ملکی فوج سے ٹکّر نہ لے بیٹھے۔

اس ادبی شہنشاہیت کے قیام میں کچھ وقت لگا اس عرصہ میں کچھ ناعاقبت اندیش ادب کے میدان میں چور دروازوں سے داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ ابھرتی ہوئی شہنشاہیت کے اشارے پر ان کا پڑا کر دادیا گیا تاکہ ان کے انجام سے ان لوگوں کو جو ادب کے میدان میں داخل ہونے کے لئے پر تول رہے ہوں عبرت حاصل ہو اور وہ اپنے جامہ میں آجائیں۔

جب ادبی آمریت اپنے "جدید قوانین" سے مسلح ہو کر میدان میں آئی تو اس دم خم سے کہ دیکھنے والوں کے "چھکے چھوٹ گئے"۔ ہر چند کہ یہ ملک میں ایک طرح کی متوازی حکومت ہی تھی۔ مگر فوج اور پولیس رکھنے کی مقدرت نہ تھی۔ چنانچہ تادیبی کارروائیوں کے لئے، ادبی ٹولوں سے یہ کام نکالا گیا وہ ذہنی عقوبت کے ایسے ایسے تیر بہدف نسخے کام میں لاتے تھے کہ ان کی حکمت عملیوں پر ملکی فوج اور پولیس بھی رشک کرنے لگی۔

اب جو ادبی ٹولوں کو رواج دیا گیا تو جملہ ادیب اور شاعر اپنا اپنا

محاذ قائم کر کے ادب کی چوکسی پہ بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ لہٰذا ایک بڑے ادیب کا گذر دوسرے ادیب کے ٹولے میں کہاں۔ چنانچہ محفل کی رونق کے لئے جملہ خستہ حال اور کمتر قسم کے لکھاڑوں کا انتظام کیا گیا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے نااہل اور ناکارہ قسم کے "ادبی ہونق" بہم پہنچائے گئے جو ہمیشہ بڑوں کی نظرِ کرم کے محتاج رہیں۔ ان "بے روح و بے ضمیر ہونقوں" کے سپرد صرف خوشامد اور چاپلوسی کا کام کیا گیا۔ اس کے صلہ میں ان کی ہر قسم کی خرافات ادبی رسالوں میں بار پانے لگیں اور بھلا بار کیسے نہ پاتیں ایک بڑے ادیب کی سفارشی چھٹی کے ساتھ میدان میں وارد ہوئی تھیں یونہی دھم سے تو نہیں کود پڑی تھیں۔ حوالی موالیوں کے جمِّ غفیر کے طفیل جب چرچا بڑھا تو بڑے بڑے ایوانوں تک پہنچا۔ ادھر بھی اپنے ہی نیاز مند تھے۔ انھوں نے خطرے کی بُو سونگھ کر یاروں کو سمجھایا کہ ایسے لوگوں کو قابو میں رکھنا ضروری ہے لہٰذا بھانے بھانے نذریں گذرانی گئیں۔ دن پھرے، سوجھ بوجھ بڑھی تو احساس ہوا کہ بعض دفعہ غیروں کے رسالے میں سفارشی خطوط کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا۔ اس سے بھی خاصی طبیعت منغّض ہوتی

ہے۔ کیوں نہ خود ہی رسالہ بازی کا دھندا شروع کر دیا جائے ایک تو سارا شاگرد پیشہ رعب میں آجائے گا دوسرے نذرانوں کی بارش کے سلسلہ میں لوگوں کے دلوں میں جو شکوک پیدا ہوئے ہیں وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ اب جو "اپنے ادب میں اپنا راج" شروع ہوا تو منادی کرا دی گئی کہ ادھر کوئی پرندہ پر مارنے نہ پائے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی احمق اس تصوّر میں گم ہو کہ "درِ اقدس پر جبہ سائی" کے بغیر اسے بار مل جائے گا تو وہ اپنے کان کھول لے۔ اعلان کے باوجود کچھ احمقوں نے اپنے کان نہ کھولے نتیجہ میں اپنے کیئے کی سزا پائی یعنی اس کے مضمون یا نظم کو ایسا گہرا دبا دیا گیا کہ پھر اس کی خبر نہ آئی۔ مزید سزا کے لئے اپنے "پالتو ہونقوں" کو اس غریب پر ہشکا دیا گیا تاکہ بطرزِ ادیبانہ تحقیر و تذلیل کر کے اس کے ذہن کو اتنا مفلوج و ماؤف کر دیں کہ تا زندگی ادبی میدان کا رخ نہ کر پائے۔ آخر اسے اس گستاخی اور جرأت کا پورا پورا مزہ تو معلوم ہو۔

ادھر وہ جو ایک محترمہ برسوں ہوئے میدان میں گھس پڑی تھیں۔ وہ موجودہ دانشوروں کی غیرت کے لئے مستقل ایک للکار بنی ہوئی تھیں بات بھی تو ٹھیک ہی ہے۔ کسی بارگاہ میں خراجِ عقیدت

پیش کئے بغیر اگر کوئی شخص ڈھٹائی سے گھس پڑے تو صاحب کشف و کرامات کی اس میں صریحاً سُبکی نہیں تو اور کیا ہے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں انتہائی دیدہ دلیری سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتیں اور خم ٹھونک کر برابر کی دعویدار بن بیٹھی تھیں۔ ہر چند کہ مرحلہ کے اُس پار تھیں مگر اب بھی جب ان کا چھاتی پر مونگ دلنا یاد آتا تو سینوں میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔

اب کیا ہو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ارے ایک دم جیسے یاروں کو کچھ یاد آ گیا۔ بھئی پچھلے مرثیے چھوڑو۔ اب کی بات کرو۔ اب اگر کوئی عورت اس دیدہ دلیری اور ڈھٹائی سے میدان میں گھس آئے تو ہم سے رہی۔ مگر وہاں تو ان تِلوں تیل ہی نہ تھا۔ آتا کون لے دیکر ایک مشتاق کاظمہ نظر پڑیں بھی تو کیا بالکل بیکار اور ہر بات سے بے نیاز نکلیں۔ یہاں بھی یہی مشکل کہ انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ خود چلنا سیکھ چکی تھیں اس لئے قابو میں نہ آتی تھیں۔ انھیں برسوں جلایا تپایا، کبھی کبھی پذیرائی بھی کی کہ شکار بد کے نا مگر وہاں تو پتھر پر جونک لگنا تھی نہ لگی۔ بہتیرا ڈھب پر لانے کی کوشش کی پر ان میں یقیناً شئے لطیف کی کمی تھی۔ ہر بات کو ہنسی میں اڑانے کا فن کچھ یوں ان کے مزاج کا خاصہ بن چکا تھا کہ کسی کی پیش ہی نہ جاتی تھی

معلوم ہوتا تھا کہ محترمہ نے لفظ "زندگی" کو ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہ دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ بے بس ہو کر ان سے دستبردار ہونا پڑا۔ ارے ہاں ایسے بدمذاقوں سے کوئی کب تک سر کھپائے۔

آخر دانشور تھے بات سمجھ میں آ ہی گئی۔ ع اپنی دنیا آپ پیدا کر۔ بھئی یہ نخرا نٹ چڑیلیں تو اپنے ہتھے چڑھنے سے رہیں۔ بات جب ہی بنے گی جب احمق اور ناتجربہ کار قسم کی بھولی بھالی ہرنیوں کا ہانکا کچھ اس ڈھب سے کیا جائے کہ دام میں پھنس کر اپنی ساری چوکڑی بھول جائیں ویسے بھی جانتی ہی کیا ہیں یہ عورتیں سوائے دو چار ناز نخروں کے۔ رہی ادب کی بات تو دنیا میں آج تک تو کوئی عورت ادیب بن نہ سکی۔ چہ جائیکہ اپنے ملک کی خواتین ان بے چاریوں کی تو ہستی ہی کیا ہے۔ البتہ ہم سے رجوع کریں گی تو ہم انھیں ادب کے "بحرِ ناپیدا کنار" میں ڈبکی دے کر "ادبی پالنے" میں جھلائیں گے۔ اگر عقل مندی سے کام لے کر خراج عقیدت پیش کریں گی تو پالنے میں پڑے ہی پڑے عظیم ادیبوں اور دانشوروں کی صف میں پہنچا دی جائیں گی۔

تجربہ سے یہ نسخہ تیر بہدف ثابت ہوا یعنی اتنا موثر اور زود اثر کہ ع ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ بر کف۔ کا سماں بندھ گیا۔

جب تمام نوگرفتار ادبی بندشوں میں اچھی طرح جکڑ دی گئیں

تو ادب پر برسوں سے جو جمود طاری تھا وہ ختم ہو گیا۔ اور ہوتا کیسے نہیں اتنے پاپڑ جو بیلے گئے تھے تو کیا مفت میں۔

پر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ ایک دم چوکنّا ہو گئیں اور اس بات کے درپے ہوئیں کہ ان محفلوں میں اپنے در آنے کا جواز پیدا کریں۔ "ہم بھی شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ہم بھی ادیب ہیں۔ یہ رہی ہماری غزل اور یہ ہے ہمارا افسانہ۔ لیجئے اور سیدھی طرح اسے اپنے رسالوں میں شائع کیجئے"۔

اب چھاپتے ہیں تو مشکل اور نہ چھاپیں تو مشکل، کیونکہ اصلاح کا نام لیتے ہی شکار بانسوں اچھلنے لگتا۔ آخر ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے بہانے جملہ "ادبی عجوبے" منظرِ عام پر آنے لگے۔ ہولے ہولے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر قسم کی بندش سے آزاد اشعار اور ریڈیو کے "ہچکی ڈراموں" کی طرز پر پھُس پھُسے افسانے جن کی ٹکنیک میں الفاظ سے زیادہ نقطوں کو دخل ہوتا ہے ادبی رسالوں کی زینت بن گئے۔

پھر وہ اور بڑھیں اور پھیلیں اور پھیلتی ہی چلی گئیں اور بڑھتی کیسے نہیں ان بے جا ناز برداریوں نے ان کے دماغ جو ساتویں آسمان پر پہنچا دیئے تھے۔ اب وہ منہ لگائی ڈومنیوں کی طرح تال بے تال

گاتی ہی نہ تھیں بلکہ بڑے دھڑلے سے ان ہی دانشوروں اور ادیبوں کی پگڑیاں اچھالتیں، جنھوں نے انھیں ادب میں درآمد کیا تھا۔

یہ حالت دیکھ کر ذہن و دماغ کی مالک متین اور سنجیدہ لکھنے والیوں نے ادب کو دور سے ہی سلام کیا اور "ادبی عجوبوں" کے حق میں دستبردار ہو گئیں۔

"چلو بہت ہی اچھا ہوا، ان بدذوق خواتین سے تو جان چھوٹی" سارے دانشور ٹولے نے دانشورانہ رائے دی، "اب تو تادمِ مرگ FRUSTRATION کی ماری یہ خواتین، ادبی میدان کا رخ نہیں کریں گی۔ حسن کم، ادب پاک۔"

# ڈبلا ہونے کی خاطر

خدا جانے کیا ہوا کہ موٹاپا ایک دم رحمتِ خداوندی بن کر مجھ پر نازل ہوا۔ اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ حد تو یہ ہے کہ جب کہنے سننے والوں نے کرسیوں اور چارپائیوں کی حالت پر ترس کھانے کی درخواستیں پیش کیں تب بھی مجھے یقین نہ آیا کہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ البتہ میں کبھی کبھی اپنے "جُثّہ" پر ایک نظر ڈال کر یہ تسلی کر لیتی تھی کہ سچ مچ کہیں صورتِ حال قابو سے باہر تو نہیں ہو گئی۔ بدنصیبی سے ہمیشہ ہی میری نظروں نے مجھے دھوکا دیا اور میں لاعلمی میں موٹاپے کی منظورِ نظر بنتی چلی گئی۔ لیکن اس لاعلمی کا دور آخر ہو کر رہا۔ ایک روز کپڑوں کی تلاش میں ایک ایسی قمیص پر نظر پڑی جو اپنی "فراخی

کی وجہ سے معتوب گردان کر اس خیال سے ایک کونے میں ڈال دی گئی تھی کہ کبھی بشرطِ فرصت "نابکار" کو اس فراخی سے نجات دلا کر انسانیت کے جامہ میں لایا جائے گا۔ جونہی وہ نظر پڑی تو اس کی درستی کی سوجھی۔ لیکن اسے "زیبِ تن" فرمانے کی دیر تھی کہ غفلت کے پردے ایک اک کر کے آنکھوں سے اٹھ گئے۔ "ناہنجار" نے چہار جانب سے جسمِ "عریض" کو یوں شکنجہ میں جکڑ لیا کہ اس سے رہائی پانی مشکل ہوگئی۔ یوں اس صداقت پر ایمان لاتے ہی بنی کہ جانِ زار موٹاپے کا "شکار" ہی نہیں بلکہ "شاہکار" بن چکی ہے۔

"اب کیا ہو؟ موٹاپے کے اس عذاب سے کس طرح نجات ملے"۔

"اس کا تو بس ایک ہی علاج ہے" کسی نے مشورہ دیا "صبح و شام ورزش کرو! ورزش!"

مگر کس قسم کی ورزش مشورہ دینے والے اس بارے میں قطعاً کوئی رہنمائی نہ کر سکے۔ تاہم انیسہ بیگم اس معاملے میں خاصا تجربہ رکھتی تھیں وہ جب ملیں تو باتوں کے دوران میرے جسم و جُثہ کا بھی جائزہ لیتی رہیں۔ آخر رہ نہ سکیں۔

"بُرا نہ مانئے مجھے آپ کے اس موٹاپے سے اختلاف ہے"۔

"کوئی تدبیر؟" میں نے اپنی لاچاری دکھائی۔

"ایک ورزش ہے بڑی آسان اور آزمائی ہوئی روزانہ صرف پانچ منٹ صرف ہوں گے۔"

"ارے جلد بتاؤ۔" میں اس کم خرچ بالا نشین قسم کے نسخے پر ریجھ ہی تو گئی۔

"اوں ہوں! زبانی نہیں یوں" اور وہ جھٹ اپنا لاڈلا میری گود میں تھما عملی مظاہرے پر تل گئیں۔

بات سہل سی معلوم ہوئی اس لیے دوسرے ہی دن اس پر عمل کرنے کی ٹھانی۔ مگر صبح اٹھتے ہی جو ترنگ آئی تو یکے بعد دیگرے ورزش کے کئی قسم کے نسخوں پہ عمل کر ڈالا۔ یعنی پہلے انیسہ بیگم کا بتایا ہوا نسخہ آزمایا جب اس سے جی کو تشفی نہ ہوئی تو ایک اور ورزش اتنی دیر جاری رکھی کہ طبیعت کی ساری جولانی رفوچکر ہو گئی۔

دوسرے دن بھی اس پروگرام کو جیسے تیسے نبھایا۔ مگر تیسرے روز پتہ چلا کہ صورت حال دگرگوں ہے، یعنی ورزش تو کجا بستر سے اٹھنا ہی کار دارد تھا۔ بدن کا جوڑ جوڑ شدید درد میں مبتلا حرکت کرنا دوبھر اور بچاری توند جس کے "حجم" کو کم کرنے کے لیے یہ سب پاپڑ بیلے جا رہے تھے اس کی حالت ان مارا مار جھکولوں سے پکے پھوڑے کی مانند ہو گئی جان کی سلامتی بہرحال مطلوب تھی،

لہٰذا اس نامعقول ورزش سے دستبردار ہونا پڑا۔

تنگ آ کر کم خوری کے نسخے پر عمل شروع کیا اور جب کمزوری بڑھنا شروع ہوئی تو اپنے حسابوں سمجھے کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا مگر ایک "نیک نہاد" ڈاکٹر نے مجھے ایسا ورغلایا کہ اس کے مشورہ کا قائل ہونا پڑا "کم خوری سے مستقل فائدہ ہرگز نہ ہوگا اس کا تو ایک ہی علاج ہے چکّی پیسیئے! چکّی!"۔

بات دل کو لگ گئی اور اس پسنہاری کا چھڑی کی طرح نازک جسم نظروں میں گھوم گیا جو بات کرتے سیروں اناج پیس لیتی تھی اور یہ بڑی چکّی پکڑ کر جب وہ پھیرتی تو معلوم ہوتا کہ ہوا میں تیر رہی ہے۔

اس پروگرام پر عمل کرنے میں ایک ہی دقّت نظر آئی، وہ یہ کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پیسے جانے کیلئے اتنا سارا اناج دستیاب کہاں سے ہوگا۔ گھر میں جب سے آٹے کا رواج چل پڑا تھا —— گیہوں کا دانہ تک دیکھنے کو نہ ملتا تھا۔ اناج کی خریداری میں ڈر تھا کہ گھر والے جو پہلے ہی میرے تجربوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔ خیر میں نے سوچا پسنہاری سے کہہ دیں گے کہ وہ اپنی پسائی کی جنس ادھر ہی لے آیا کرے مفت میں کام ہوگا۔

اس قدر جامع پروگرام بنانے کے بعد میں نے دھول میں اَٹی چکّی کا جا کر جائزہ لیا۔ دوپہر کے قریب کا عمل ہو گا کہ میں نے یہ بڑی چکّی گھسیٹ کر نیم کے سائے تلے لا ڈالی۔ جھاڑ پونچھ کے بعد سوچا لگے ہاتھوں اس کا افتتاح بھی ہو جائے۔ پیسی جانے والی اشیائے کی تلاش میں گھر کے تمام ٹین ڈبے تل پٹ کرنے پڑے تب کہیں جا کر اک ذرا سی چنے کی دال برآمد ہوئی یہ واحد شے تھی جسے خالص بیسن میں تبدیل کر کے معترضین کو پروگرام کی دوگونہ افادیت کا قائل کیا جا سکتا تھا۔

بس اب کیا تھا لپک جھپک چکّی کے منہ میں ڈھیروں دانے انڈیل میں نے اسے گردش دینا شروع کیا، جونہی چکّی رواں ہوئی تو عالم خیال میں بیسن کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے نظر آنے لگے جتنی تیزی سے چکّی گردش کر رہی تھی میں بھی اُسی پھرتی سے اس کے منہ میں دانے انڈیل رہی تھی پر نہ جانے کیا ہوا کہ بیسن کا ڈھیر ہی وجود میں نہ آیا۔ چکّی کی اس سمائی پر عقل گُم تھی کہ اک ذرا جو گرنڈ کی طرف نظر کی تو بیسن کی بجائے دال کے ثابت دانے ادھر ادھر بھاگتے نظر آئے۔ دماغ کی ساری بلند پروازی غائب ہو گئی۔ سر پیٹنے کو دل چاہا مگر عین موقع پر صبر و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے بچ نکلنے

والے دانوں کو پکڑ کر چکی کے منہ میں ڈالنا شروع کیا۔ پر واٹے ناکامی معاملہ اُدھ پیسے دانوں سے آگے نہ بڑھ پایا اور خالص بیسن کے حصول کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ تاہم معترضین کے سامنے سرخروئی کا سوال تھا سو چاپ کی بار ایسی چیز پیسی جائے جو پلک جھپکتے میں سُرمہ بن کر رہ جائے۔ گھبراہٹ میں جس شے پر نظر پڑی وہ سرسوں کے چند دانے تھے جو خدا جانے کس مصلحت سے گھر میں پڑے رہ گئے تھے۔ دل کی کلی کھل اٹھی۔ اگر یہ کم بخت پہلے سے نظر پڑ جاتے تو اپنی جان بھی اتنی ہلکان نہ ہوتی۔ کام بھی تکمیل کو پہنچ جاتا اور یہ جو بچوں سے لے کر بڑے تک میری حرکتوں کو چھُپ چھپ کر ٹیپ رہے ہیں انھیں بھی کچھ کارگزاری دکھانے کے موقع مل جاتا۔

عین اس وقت جبکہ سورج سوا نیزے پر اُتر آیا تھا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بھر بھر مٹھی سرسوں کے کرکراتے دانے چکی کے حلق میں اتار دیئے، چکی نے اس سہولت سے گردش کی کہ دل باغ باغ ہوگیا، زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ قدرت نے کم ازکم ایک اناج تو ایسا پیدا کیا ہی ہے جس کا پیسنا مجھ جیسے اناڑیوں کے لیے بھی سہل ہے۔ طبیعت ترنگ میں تھی اور چکی رواں دواں کہ یکایک ایسا لگا جیسے بریک لگ گئے ہوں دل دھک سے رہ گیا

کہ خدا نہ کرے جو پہلے کی طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑے۔ اب بہتیری کشتم پچھاڑ کی، بہتیری کھینچا تانی کی مگر صاحب وہ ٹس سے مس ہو کر نہ دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ چکّی کے دونوں پاٹ سریش سے چپکے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی تنگ آ کر چمٹا، کھرپی، چھری اور درانتی جیسے مختلف النوع اوزاروں کی مدد سے اس کے ہر پہلو پر وہ کاری ضربیں لگائیں کہ ساری یکجہتی پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ صورت حال سامنے آ گئی تو میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یعنی کہ سرسوں چکّی میں پسی ہی نہیں بلکہ پیلی جا چکی تھی اور تیل نکلنے میں ذرا سی کسر رہ گئی تھی۔

اپنی کم عقلی پر ماتم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اگر گُر کی باتیں پہلے سے گرہ میں باندھ لی ہوتیں تو آج یوں ناکامی کا منہ دیکھنا تو نہ پڑتا —— مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس طویل اور ناکام نبرد آزمائی سے جی ایسا ندھال ہوا کہ چپ چاپ منہ لپیٹ کر پڑ جانے میں ہی عافیت نظر آئی۔

ادھر میں زک پر زک اٹھا کر جی چھوڑ بیٹھی تھی ادھر کچھ "ہم جنس" دوست نت نئے تجربوں میں مصروف تھیں۔ انہی صفِ اول کے مجاہدوں میں خالدہ بیگم بھی تھیں وہ دُبلا ہونے کے فن پر مکمل عبور حاصل کر چکی تھیں اور فاتح اعظم بن کر میدان پر میدان مار رہی تھیں۔

ملنے تو آتی ہی نہ تھیں بس ہر بار فون پر یہی مژدہ سناتیں کہ دُبلا ہونے کے لیے بڑے سخت جتن کر رہی ہیں کس قسم کے جتن ؟۔ میں ہر بار ان کی آواز پر سراپا اشتیاق بن جاتی مگر ظالم وہ تیر بہدف نسخہ بتا کر نہ دیتی۔

آخر ایک دن جب اپنے حسابوں وہ نزاکت کے سانچے میں ڈھل کر "سینک سلائی" بن چکی تھیں درشن دینے چلی آئیں۔ دیکھ کر خاصی عبرت ہوئی کہ پہلے تو اچھی بھلی آدمی کا بچّہ تھی۔ تاہم ان کا "ہیولا" میرا ایمان متزلزل کر کے رہا۔ کچھ بھی ہو اس نے منوں تھپے ہوئے گوشت کو تو اُتار پھینکا ہے۔

میں جانتی تھی کہ لوگ اپنے مجرّب نسخے آسانی سے نہیں بتاتے۔ ایسے راز بڑے ہتھکنڈوں سے اُگلوانے پڑتے ہیں۔ لہٰذا باتوں کے دوران میں ان کے جسم وجثہ کا تعریفی نظروں سے جائزہ لیتی رہی۔

"ارے کیا دیکھ رہی ہو ؟"۔ آخر میری مسلسل نشانہ بازی نے اثر دکھایا۔

"خدا نظرِ بد سے بچائے بالکل سانچہ میں ڈھلی ہوئی لگ رہی ہو"۔ میں نے جان بوجھ کر مبالغہ سے کام لیا۔

"ہمارے ہے تو ..... تم ... ... تم بھی تو"۔ وہ ہکلائیں۔

"اے خاک ! لو اور سنو تمہارے تو پاسنگ بھی نہیں"۔ میں نے کسر نفسی

دکھائی۔

"تو چاہتی کیا ہو؟" وہ ذرا نرم پڑ گئیں۔

"یہی کہ وہ نسخہ مجھے بھی بتاؤ جو تم نے استعمال کیا ہے۔"

"رہنے دو، تمہارے بس کا نہیں ہے یہ روگ۔"

"کیوں نہیں ہے! صفا بات کہو نا کہ تم مجھے بتانا ہی نہیں چاہتی ہو۔" میں نے دھونس جمائی۔

"اچھا تو لو!" وہ یکدم پھٹ پڑیں۔ "ہمّت ہے تو آجاؤ میدان میں، ایک ماہ مسلسل فاقہ کرو۔"

ایک ماہ مسلسل فاقہ —؟ کیا کہہ رہی ہو؟" — میری روح لرز اٹھی۔

"ہاں ہاں! بالکل ضروری ہے یہ۔"

"لعنت تمہارے اوپر، مجھے مارنے پر تلی ہو۔"

"بس چھوڑو تم سے کچھ نہ ہوگا۔"

"مبارک رہے تمہیں اپنا فاقہ زدہ پروگرام، میں تو باز آئی۔" میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"دھڑا دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ یا اللہ یہ آج کیا آفت نازل ہوئی گھر پہ"۔ سوتے سے جو میری آنکھ کھلی تو ایسا معلوم ہوا جیسے سڑک کٹ رہی ہو۔ اٹھ کر دیکھتی ہوں تو ہمشیرہ صاحبہ بچوں کی پوری کھیپ کے

سامنے رسّی کُودنے کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور بچارے بچے گم سم اپنے فن کی مٹی پلید ہوتے دیکھ رہے تھے۔

"ارے! ارے! دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔"

"چپ رہو جی۔" وہ ہکلائیں سانس تھا کہ قابو ہی میں نہ آتا تھا مگر بولیں۔ "خود جو بے ہنگم ہو چاہتی ہو سب ہی ایسے ہو جائیں!"

"پر اس دوپہری ٹھہری میں تو قرار پکڑا ہوتا۔ ایسی بھی کیا افتاد؟"

"افتاد کیسی؟ ہم رسّی کُودنا سیکھ رہے ہیں!"

"ارے تو کیوں؟"

"اے ہے تمہیں تو اتنا بھی پتہ نہیں۔" آخر وہ جھلّا گئیں۔ "بہترین ورزش ہے یہ۔ موٹاپے کے لیے۔"

"لعنت ہے ایسی ورزش پہ مجھ سے تو یہ اچھل کود کبھی نہ ہو۔" میں نے احتیاطاً پیش بندی کی۔

"ارے کوئی مشکل نہیں لو آؤ تو ذرا۔" انہوں نے مجھے پھسلایا اور کُود کر رسّی میری طرف لے آئیں۔

"توبہ کرو کوئی وقت بھی ہو! شام کو دیکھیں گے۔" انھیں پسینہ میں تر بتر دیکھ کر آخر میں بھی بولی کہ یہ تو چربی پگھلانے کا بہترین حربہ ہے۔ مگر انھوں نے میرے ارد گرد رسّی کے چکّروں کی بارش شروع کر دی

پھٹا پھٹ ۔ پھٹا پھٹ! رسی گردش میں تھی۔ بہتیرا منع کیا! لیکن ہمشیرہ صاحبہ باز ہی نہ آئیں۔ آخر سر پر منڈلاتی ہوئی رسی سے جب مفر کی کوئی صورت نہ دیکھی تو جھنجھلا کر میں نے ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ مگر یہاں تو معاملہ سُر تال کا نکلا۔ کودتے کودتے میرے پاؤں شل ہو کر رہ گئے پر رسی میرے پاؤں تلے سے نکل کر نہ دی۔

"کوئی بات نہیں بس دو چار دن لگیں گے۔" اس خیال سے کہ کہیں میں جی نہ چھوڑ بیٹھوں انھوں نے مجھے تسلی دی، مگر میں خوب جانتی تھی کہ یہ نرا فریب ہے، اسکول کے زمانہ میں دن تو کیا ہفتوں اس مشق کی نذر ہو گئے پر کامیابی نہ ہو سکی، اور ہم چشموں میں ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنی سبکی ہی ہوئی۔

دس پندرہ دن جوں توں یہ پروگرام چلا مگر نہ تو اس فن کی ہی کچھ شُدبُد ہوئی اور نہ موٹاپا کم ہونے کے آثار دکھائی دیئے۔ ایک پیچ و تاب کا عالم تھا کہ طاری تھا۔ تھک ہار کر دونوں فن کاروں نے فن کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لیا۔

آخر میری بیٹی کی محبت نے جوش مارا، پہلے تو وہ میرے جلہ پروگراموں کو شک اور حیرت سے دیکھتی رہی مگر جب اس نے دیکھا کہ میں واقعی دُبلا ہوئے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گی تو اسے مجھ پر بڑا ترس آیا۔

"امّی آپ پریشان نہ ہوں وہ بڑے پیار سے آکر مجھ سے لپٹ گئی میں شام کو آپ کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلوں گی سب ٹھیک ہو جائے گا۔

"ارے ہاں بیٹی! مگر تمہیں اتنی فرصت کہاں"۔

"آپ میری فکر نہ کیجئے کچھ بھی ہو بس کل سے یہ پروگرام شروع"۔ بھلا ایسے میں اس سے حیل وحجت بھی کیا کرتی وہ میرے فائدہ ہی کی تو کہہ رہی تھی۔

دوسرے دن شام کو دفتر سے واپسی پر ابھی میں نے کھانا زہر مار کر کے بستر پر کمر لگائی ہی تھی کہ صاحبزادی صاحبہ ریکٹ ہلاتی ہوئی میرے سر پر آموجود ہوئیں۔

"چلئے اب پانچ بج چکے ہیں"۔ اس نے دوسرا ریکٹ میرے بستر پر لٹکا دیا ریکٹ کی موجودگی میں تفصیلی سوال کی گنجائش ہی نہ تھی

"ہاں ہاں ابھی چلتے ہیں"۔ میں نے بڑے پیار سے اسے بہلایا۔ اور اخبار اُٹھا لیا۔ گھبراہٹ میں جلدی جلدی اخبار کے صفحے اُلٹنے شروع کئے۔ مارے بیڈ منٹن کے ہول کے ایک لفظ بھی پلّے نہیں پڑ رہا تھا مگر وقت گزاری کے لیے یہ ضروری تھا کہ پیٹ کا کھانا کچھ تو نیچا ہو۔ پر ہائے ناکامی ابھی میری اخباری معلومات آدھ بیچ میں ہی تھیں کہ صاحبزادی صاحبہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے بغیر کچھ کہے اخبار جھپٹ کر

ریکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

اب تو بادل نخواستہ اٹھنا پڑا۔ صاحبزادی نے کورٹ میں قدم رکھتے ہی اعلان کیا:

"بس پوائنٹ وائنٹ کچھ نہیں، یونہی کھیل ہوگا۔"

میں نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا ضابطہ کی پابندیوں سے تو جان چھوٹی پر اس شریر نے تو وہ ہاتھ دکھائے کہ میں ساری چوکڑی بھول گئی۔ یعنی بے ترتیبی میں بڑی ترتیب سے یہ حرکت شروع کی کہ ابھی شٹل کاک جال کے پاس پھینکی تو ابھی اک دم دور بائیں کونے پر اور میں سنبھل بھی نہ پاتی کہ وہ تمیرا ہاتھ کورٹ کے داہنے سرے پر دیتی۔

"ہیں ہیں ہیں میں نے اسے تنبیہ کرنا چاہی مگر سانس قابو میں ہی نہ تھا تھا۔ بولا ہی نہ گیا۔

"ہاں لیجئے۔" مزید شرارت سے اس نے اب کی بار شٹل کاک جو آسمان پر اچھالی تو زمین سے دو فٹ اچھل کر اسے قابو میں کرنا پڑا۔ دس منٹ کے اس عمل سے ہی میں پسینہ میں شرابور ہوگئی اک ذرا ہاتھ روکا ہی تھا کہ سامنے جو نظر پڑی تو ہمسایوں کے بچے باڑھ سے لگے میری اس اُچھل کود سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"لاحول ولاقوۃ! اچھا تماشہ بنایا تم نے میرا، بس ٹکٹ اور لگا دو۔"

غصّہ میں میں کبھی اپنی ہئیت کذائی کو دیکھتی اور کبھی سامنے کھڑے بچوں کی فوج کو۔

"تو آپ گھبراتی کیوں ہیں؟" اس نے اُلٹا مجھے قائل کیا۔

"میں کیوں گھبراتی؟ نامعقول بچے، ادھر ہی تکے جا رہے ہیں۔"

اس وقت ساری معصوم شکلیں مجھے شیطانی چہرے نظر آرہے تھے، جی چاہتا تھا کہ پکڑ کر سب کی آنکھوں پر پٹی باندھ دوں۔

ایک تو گرمی کے مارے جی بولا رہا تھا اوپر سے بٹیی کا تقاضا کہ اور کھیلو۔ اور وہ نالائق بچے تھے کہ ٹلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ تنگ آکر میں نے ریکٹ پھینک دیا۔

دوسرے دن بٹیی کے ہاتھ میں ریکٹ دیکھتے ہی میں بدکی۔ "بھئی ان شیطان بچّوں کا تو کچھ کرو۔ یوں تکتے ہیں جیسے میں کوئی مداری ہوں"

"اچھا یہ بات ہے تو آپ ٹیبل ٹینس کھیلئے"۔ صاحبزادی صاحبہ نے بڑی ہوشیاری سے دوسرا پانسہ پھینکا۔

"ارے ہاں!۔ یہ ٹھیک ہے! رات کو کھیلا کریں گے۔" میں نے سوچا ٹیبل ٹینس میں نہ تو یہ جان لیوا بھاگ دوڑ ہوگی اور نہ رات کو وہ شیطان بچے مجھے ٹیپ سکیں گے۔

اب جب بھی کھیلنے کا ارادہ کیا با نو بجّے مصروف ہوتے ہیں یا میں

ہیکا سر تمام تھک ہار کر پڑھ جاتی ہوں۔

"امّی ہم خوب جانتے ہیں آپ کھیلنے سے جان بچاتی ہیں جان!"۔

تینوں بچے جب کبھی شرارت سے مجھے چڑاتے ہیں تو میں سٹپٹا کر رہ جاتی ہوں۔

# بدلتا ہے رنگ

{اس دل خوش کن واقعہ کی یاد میں جب
قومی اسمبلی میں خواتین کو نشانۂ تضحیک بنایا گیا}

سارے مرد ہکّا بکّا دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور عورتوں کی مسلّح فوج نے مردوں کے ہاتھ سے سارا انتظام چھین، ملک پر قبضہ کر لیا۔ نہ خون خرابہ ہوا، نہ کہیں آگ لگی، نہ گولی چلی اور وہ سارے ملک پر چھا گئیں۔

"اجی بس چار دن کی چاندنی ہے، بھلا حکومت ان عورتوں کے بس کا روگ کہاں"۔ ایک صاحب نے کھسیان پن مٹانے کو گُل افشانی کی۔

"خاموش! ورنہ گولی مار دی جائے گی"۔ مورچہ میں سے ایک عورت نے للکارا اور وہ سہم کر اپنا سامنہ لیکر رہ گئے۔

گھنٹہ بھر کے بعد ریڈیو سے اعلان کیا گیا کہ سارے مرد جہاں کہیں بھی ہوں اور جس حال میں بھی ہوں فوراً اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں اور اپنے ریڈیو کھول لیں۔ تاکہ ہر گھنٹہ نشر ہونے والے نئے اعلانات سے باخبر رہیں۔

"ارے بھئی اب یہ ظلم ہے کہ نہیں"۔ انھوں نے بیوی کے دفتر سے آتے ہی فریاد کی۔

"کیسا ظلم؟" بیوی جان بوجھ کر انجان بن گئیں۔

"یہی کہ اب ہم مردوں کا باہر نکلنا بھی بند ہو گیا"۔ مصلحت اور حالات دیکھ کر انھوں نے بڑی نرمی سے وضاحت کی ورنہ ان کا بس چلتا تو بیوی کی منڈی مروڑ کر رکھ دیتے۔

"تو میری جان تمہیں اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم اپنا گھر بار سنبھالو اپنے بچوں کو دیکھو، ارے ہم جو موجود ہیں باہر کے بکھیڑوں کے لئے ــــ"

بیوی کے لئے انھیں بہلانا کوئی مشکل کام نہ تھا وہ بڑے بڑے ضدی بچوں کو شیشے میں اتار چکی تھیں۔

"بھئی حد ہے!" معاملہ کی نزاکت کے پیشِ نظر وہ اور کچھ نہ کہہ سکے اور دم بخود ہو کر رہ گئے۔

ہر چند کہ مردوں کو گھروں میں بند کر کے ان کے پر پُرزے جھاڑ دیئے گئے تھے۔ مگر ابھی بغاوت کا خطرہ تھا۔ خاص طور سے جب عورتیں دفتروں میں ہوتیں تو وہ اپنے گھر کے مردوں کی طرف سے فکرمند رہتیں کہ کہیں یہ کم بخت انھیں بے خبر پاکر آپس میں سازباز نہ کر بیٹھیں اور گھر بار چھوڑ کر نہ نکل کھڑے ہوں۔ اعلیٰ احکام سے جوں ہی اس خدشہ کا اظہار کیا گیا۔ طے پایا کہ فوراً عورتوں کی مسلح فوج، گلی کوچوں میں متعین کر دی جائے تاکہ گھردار مرد ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں۔ ادھر ریڈیو کے تازہ اعلامیہ میں مردوں کو خبردار کیا گیا کہ وہ اپنے ہمسایوں سے ملنا جلنا ترک کر کے اپنے گھروں کی طرف متوجہ ہوں تاکہ عورتیں یکسوئی سے ملکی امور انجام دے سکیں۔ نافرمانی کی صورت میں گھر سے باہر قدم نکالنے والے شخص کی ہرگز جان بخشی نہ ہوگی۔

اس خبر سے سارے مرد ٹُھن ٹُھن ہو کر رہ گئے۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ کچھ باتونی کاہل اور کام چور مرد اپنے پڑوسیوں کے گھر بیٹھے گپیں مار رہے تھے اس خبر کے نشر ہوتے ہی، اپنے اپنے بچوں کو بغل میں

داب نگبٹٹ اپنے گھروں کو بھاگے اور اندر دبک کر بیٹھ گئے۔

ایک نافرمان اور گستاخ قسم کے مرد نے پکانے ریندھنے کے کام سے صاف انکار کر دیا۔

"میں یہ ذلیل کام نہیں کر سکتا"۔ وہ دونکا۔

"اجی تمہارے تو اچھے خاں کریں گے یہ کام"۔ بیوی نے دھیمے سے شوشہ چھوڑا اور اپنا ملکی زبان کا اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔

بیوی کا یہ آمرانہ انداز انھیں کھل گیا۔ لو بھلا یہ ملکی اخبار پڑھنے والیاں اور ان پر حکم چلائیں!۔ تُف ہے اس ذلت پر، وہ تو جب برسر اقتدار تھے تو انگریزی اخبار پڑھ کر بیویوں پر احکامات صادر کیا کرتے تھے اور ایسی گھرکیاں دیتے تھے کہ کم بختوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے ہی رہ جاتا تھا۔

"تو کیا میں تمہارا دست نگر ہوں جو یہ کام کروں"۔ وہ اپنی پرانی جون میں لوٹے، ابھی تو میں اپنے بینک بیلنس سے دس نوکر رکھ سکتا ہوں۔"

"کس کا بینک بیلنس! اور کیسے نوکر؟ معلوم ہوتا ہے ابھی تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئے"۔

"کیوں میرے بینک بیلنس کو کیا ہوا؟" بچارا گھگھیا یا کہ کہیں بیگم صاحبہ نے اس پر بھی ہاتھ صاف نہ کر دیا ہو۔

"ہونا کیا تھا! اُسے تمہیں میرے نام منتقل کرنا پڑے گا" بیوی نے پورے اعتماد کا مظاہرہ کیا۔

"دیکھیں گے"! انھوں نے دبی زبان سے چیلنج کیا۔ رسی جل گئی تھی مگر ابھی بل نہ گئے تھے

دوسرے دن یہ خبر حکام بالا تک پہنچادی گئی کہ ابھی مردوں میں اکڑ فوں باقی ہے۔ اس کا پورا انتظام کیا جائے ورنہ نتائج خاطر خواہ نہ نکلیں گے۔ طے کیا گیا کہ سارے مردوں کا بینک کا حساب ان کی بیویوں کے نام منتقل کر دیا جائے۔ آناً فاناً یہ خبر ریڈیو پر نشر کی گئی کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر تمام مرد بلا چوں و چرا، اپنا بینک کا حساب اپنی بیویوں کے نام منتقل کر دیں۔ ورنہ وقت گزر جانے کے بعد سزا کے مستوجب ہوں گے جو عمر قید سے لے کر پھانسی تک ہو سکتی ہے۔ مسئلہ کی سنگینی کے پیش نظر سخت سزا کا تعین کرنا ضروری تھا۔

اس خبر کے سنتے ہی سارے مرد دھم ہو کر رہ گئے، ان کا آخری ہتھیار چھین کر انھیں بالکل نہتا کیا جارہا تھا اور وہ بے بس تھے۔ سخت قسم کے خسیس اور بخیل مردوں پر یہ حکم بجلی بن کر گرا۔

سارا جاتا دیکھئے تو آدھا لیجئے بانٹ۔ ساری عمر کی جمع پونجی کھونے کے مقابلہ میں وہ اپنی بیویوں کے نام روپیہ منتقل کرنے پر راضی تھے۔ مگر انھیں ڈر تو یہی تھا کہ جو رقم انھوں نے ہزاروں دُکھ اٹھا کر اور اپنا چین آرام تج کر بچائی ہے، کہیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بنیک کا زنانہ عملہ، اس میں ہیر پھیر نہ کر جائے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی بیوی سے درخواست کی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ بنیک تک لے جائیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے حساب کو منتقل کرا سکیں۔ درخواست منظور ہوئی اور انھیں ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا۔

"چلیے تیار ہوں"۔ بچارے نے مری ہوئی آواز نکالی۔

"ارے غضب خدا کا برقع ابھی پہنا نہیں اور کہتے ہو تیار ہوں"، بیوی نے بالکل اسی طرح قہر آلود آنکھیں نکالیں، جس انداز سے وہ کبھی بیوی پر لال لال دیدے نکالا کرتے۔

"برقع ..... ایں برقع ..... تو کیا مجھے اب برقع پہننا ہوگا"۔ بچارے ابھی عادی نہ ہوئے تھے، ہر نئی بات پر بدکتے تھے۔

"ہاں تو یوں کھلے بندوں تو اب تم پھرنے سے رہے، لد گئے وہ زمانے"۔ بیوی اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

"تو کہاں ہے برقع؟" وہ فوراً سیدھے ہو گئے۔ ہیکڑی دکھانے کا موقع ہی نہ تھا۔

"یہ مجھ سے پوچھنے کی بات ہے، خود نہیں دیکھا جاتا۔" وہ بدلہ لینے پر تلی ہوئی تھیں۔

بیچارے نے مارا مار، سارے صندوق پٹارے کھکوڑے، تمام الماریاں کھنگال ڈالیں تب کہیں جا کر اس کی جان کا عذاب وہ برقع برآمد ہوا، اب جو اسے زیب تن فرماتے ہیں تو نچلا حصّہ رانوں پر آ کر لٹک گیا۔ برقع کے اوپر کے حصّہ کو انھوں نے فضول سمجھ کر ہاتھ پر ڈالا اور کھڑے ہو گئے انتظار میں۔

"یا اللہ! یہ کس عذاب میں پھنس گئی ہوں میں"۔ بیوی ان کا حُلیہ دیکھتے ہی چلائیں۔ "میں کہتی ہوں تمہیں کسی بات کا بھی ڈھنگ سلیقہ ہے، کھڑے ہو گئے اونٹ کی سی شکل لے کر، یہ برقع کے اوپر کا حصہ کیا میں پہنوں گی؟"

بیوی کے تیور دیکھ کر وہ بولا گئے، "ہُاں بھول..... ارے بھول گیا تھا، لو ابھی پہنے لیتا ہوں"۔

وقت کی کمی کے باعث جھنجلا کر بیوی نے ان کی کھوپڑی پکڑ، اس پر نقاب کے بند باندھے اور اپنے بال درست کرتے ہوئے بولیں:

"نقاب ڈال لو اور چلو۔"

بچارے سہمے اور سکڑے ہوئے بیوی کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے کہ اک دم بیگم صاحبہ نے جو مڑ کر دیکھا تو لپکیں ان کی خبر لینے۔

"ہُمنہ! اب یہ "ڈنڈو کے" باہر کیوں لٹک رہے ہیں۔ برقع کے اندر نہیں کیے جاتے تم سے، بھرے بازار کو دکھانے چلے ہیں، ہو بھی تو اتنے ہی حسین۔"

بچارا خاک نہ سمجھا اور کھمبا بن کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"میں کہتی ہوں میری شکل کیا دیکھ رہے ہو؟ یہ ہاتھ کیوں برقع کے اندر نہیں کیے جاتے۔" انھوں نے اپنے پرس سے اس انداز سے اشارہ کیا جیسے اسے سر پر دے ماریں گی۔ "اتنے ہی بے کار ہیں تو انھیں کٹوا دو۔"

مارے ڈر کے اس نے اپنے ہاتھ تہہ کر کے دونوں کندھوں کو پکڑ لیا اور بیگم صاحبہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ مگر مشکل تو یہ تھی۔ کہ بیگم صاحبہ تو ایک قد میں اس سے تین فٹ چھوٹی اور اوپر سے بڑے ٹھسّے سے سج سج چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہی تھیں اور وہ انتہائی دھیما چلنے کے باوجود ان سے آگے نکلنے کو ہی ہوتا کہ اسے قدم روک کر بیگم صاحبہ کے آگے نکل جانے کا انتظار کرنا پڑتا۔ خیر بدقت تمام

وہ منحوس بینک کی عمارت نظر آئی جو اس کے خون پسینہ کی گاڑھی کمائی نگلنے پر تیار تھی۔

بیوی صاحبہ نے وہاں جاتے ہی ایک فارم اس کے آگے دھر دیا، اور خود بینک کے عملہ کی خواتین سے یوں خوش گپیوں میں مشغول ہو گئیں جیسے بڑی با اخلاق اور خوش مزاج ہوں بچارے نے نقاب کے اندر سے ہی روپے کی منتقلی کا فارم بھرا اور سکڑ کر بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے کی خوش گپیوں کے بعد جب بیوی جان کو دھیان آیا تو بقیہ ضابطہ کی کارروائی ہوئی اور بیگم صاحبہ پلک جھپکتے میں اس کی ساری کمائی کی مالک بن گئیں۔

اب مردوں کے کس بل نکالے جا چکے تھے۔ اور وہ بڑی خوش دلی سے گھریلو کاموں میں منہمک تھے۔ عورتوں کے لئے ملکی فرائض کی انجام دہی کے واسطے فضا سازگار تھی۔ اب ان تمام ملکی اور قومی فرائض کی طرف توجہ دی گئی جن کی بجا آوری میں مردوں نے جان بوجھ کر غفلت سے کام لیا یا جنھیں عیاشیوں میں پڑ کر نظر انداز کر چکے تھے۔ رشوت اسمگلنگ اور شراب نوشی کی بندش کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ کیونکہ وہ تو خود ہی مردوں کی ان حرکتوں سے نالاں تھیں اور جب بھی وہ انھیں ان حرکتوں سے روکتیں وہ

الٹا انھیں پر غرّاتے اور باز نہ آتے۔ طرّہ یہ کہ بد نامی کا چھپر عورتوں کے سر پر کہ بھئی انہی کے خرچ پورے کرنے کے لئے وہ یہ دھندے کرتے ہیں۔ مزید لطف کی بات تو یہ تھی شراب کے ڈرم کے ڈرم چڑھا کر وہ گھروں میں، دفتروں میں اور سڑک پر راہ چلتی عورتوں کی جان ضیق میں کرتے اور انھیں ہی بدنام بھی کرتے۔ طوائفوں کا وجود مردوں کی رذالت اور جنس پرستی کا آئینہ دار تھا، جسے وہ کسی قیمت پر ختم نہ کرنا چاہتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک بار جب کسی سرپھرے نے اسمبلی میں بدکاری کے خاتمہ کا بل پیش کرنا چاہا تو ان کے چھکّے چھوٹ گئے اور اسمبلی کے اس سرے سے اس سرے تک دھمکیوں، ڈراوؤں اور تنبیہوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو پھر بل بھر میں نہ بل پیش کرنے والا نظر آیا نہ بل اور پھر جو مطلع صاف ہوا ہے تو اس دن تک یہ سلسلہ جاری رہا جب تک کہ عورتوں نے مردوں کو کان پکڑ کر گھروں میں بند نہ کر دیا۔

طوائفوں کے طبقہ کے بعد مظلوموں میں سرفہرست "ملکی زبان" تھی جسے مردوں نے سینے پر صبر کی سل رکھ کر قومی زبان کا درجہ تو دے دیا تھا مگر عملاً وہ انگریزی کے ہی پرستار تھے، حالت یہ تھی کہ ہر چھپّر دفتروں، بازاروں ہوٹلوں اور بسوں میں انگریزی

زبان کو غلط تلفّظ اور غلط لہجے میں منہ ٹیڑھا کر کے بولتا اور سمجھتا کہ عاقبت سدھر گئی۔ ذلت کی حد تھی کہ اوٹ پٹانگ انگریزی فرمانے والے کو مردوں کے معاشرے میں معزز سمجھا جاتا تھا۔ اونچی سے اونچی کرسیاں اسی ٹیڑھی میڑھی انگریزی کے بل بوتے پر نااہلوں کے قبضہ میں تھیں۔ خود انگریز بھی ان کی اس بے غیرتی اور غیر ملکی زبان کی اس احمقانہ سرپرستی پر ٹھٹھے لگاتے مگر وہ ذلت کی دلدل میں اس بری طرح پھنس چکے تھے کہ اس سے نکلنے کا راستہ نظر نہیں آتا تھا

اب یہ عورتوں کا ہی دَم تھا جس کی بدولت ملکی زبان زندہ اور باقی تھی۔ یہ عورتیں ہی تھیں جنھیں ملکی زبان کے محاورں اور روزمرہ پر عبور تھا۔ اور جب وہ مردوں کے منہ سے جو صحیح محاورے اور روزمرّہ نہ جانتے تھے یہ جملے سنتیں کہ "بھئی کیسی عورتوں کی سی زبان بول رہے ہو" یا "مردوں کی طرح سیدھی زبان میں بات کرو"۔ تو وہ اپنا کلیجہ ہاتھ بھر کا کر لیتیں اور خون کا سا گھونٹ پی کر اس امید پہ خاموش ہو جاتیں کہ کبھی تو ان کے بھی دن پھریں گے، کبھی تو حکومت ان کے بھی ہاتھ آئے گی۔

اب جب کہ وہ اپنی لیاقت، اہلیت اور جرأت سے برسرِ اقتدار آگئیں تھیں تو ناممکن تھا کہ وہ ان اہم مسائل پر توجہ نہ دیتیں

جو قومی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔ چنانچہ قومی عزتِ نفس اور وقار کی بحالی کی خاطر ملکی زبان کو دفتری زبان قرار دے دیا گیا۔ ساتھ ہی جملہ تعلیمی اداروں میں تمام مضامین قومی زبان میں پڑھانے کا حکم نافذ کیا گیا۔ سائنس وغیرہ کی اصطلاحوں کا قومی زبان میں منتقل ہونے کا مسئلہ باقی تھا۔ چنانچہ کمیشن بٹھایا گیا تاکہ جلد از جلد اس بارے میں اپنی رائے دے۔ چار دن کے بعد یہ رپورٹ پیش کر دی گئی کہ مردوں نے اس سلسلہ میں تھوڑا بہت کام ضرور کیا ہے۔ لیکن ابھی اصل کام بہت باقی ہے۔ کمیشن کی رائے میں تمام دفتری اور سائنسی اصطلاحات چار پانچ ماہ میں ملکی زبان میں منتقل ہو سکتی ہیں۔ بالآخر دفتری اور سائنسی اصطلاحات کے لئے الگ الگ بورڈ بنا دیئے گئے اور دونوں جگہ عورتیں ٹڈیوں کی طرح کام میں جٹ گئیں اور کام پانچ مہینوں کے بدلے چار مہینوں میں ہی ختم ہو گیا۔

یوں بھی عورتوں میں قوت کارکردگی نہ جانے کس بلا کی ہوتی ہے کہ یہ دفتری کام انھیں بے حد سہل معلوم ہوتے، لطف یہ کہ نہ انھیں مردوں کی طرح دفتری اوقات کے بعد دفتروں میں سر کھپانا پڑتا۔ نہ کام کی ہائے وائے مچتی کہ ہائے بہت کام ہے، لیجیئے،

دوڑیو، چلیو مرگئے ـــــ ایک نظم وضبط اور لگن کے تحت دن بھر اپنے فرائض انجام دینے کے بعد وہ مردوں کی طرح روتی بسورتی نہیں بلکہ ہنستی کھیلتی گھروں کو واپس آتیں، جیسے کھیل کے میدان سے لوٹ رہی ہوں۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ یہ دفتری کام ہیں ہی سہل جبھی تو مردوں نے ان پر قبضہ جما یا ہوا تھا اور عورتوں کو تو یہ کام یوں اور بھی سہل معلوم ہوتے کہ وہ تو ایک زمانے میں بیک وقت بچوں کو پالنے، روٹی ہانڈی کرنے، کپڑے دھونے گھر کی صفائی اور سلائی پرائی جیسے ڈھیروں کاموں کے ساتھ مردوں کے ناز نخرے اٹھانے کا کام بھی کیا کرتی تھیں اور اس پھرتی اور سلیقے سے کہ سب کام وقت پر، سب کام ترتیب سے ٹھیک ٹھاک ـــــ خدا جانے کم بختوں کی ہڈیوں میں کس قسم کا گودا بھرا ہوا تھا کہ سارے کام نبیڑ کر آرام کرنے کے بجائے وہ اپنے گود کے "ہیٹڈرے" کو ہلرہ ہلرہ جھلاتی رہتیں اور ذرا نہ تھکتیں۔

چھ مہینے کے بعد ہر دفتر، ہر محکمہ اور ہر شعبہ میں ملکی زبان کا بول بالا ہو گیا اور ملکی زبان کے اپنانے کے سلسلہ میں مردوں کی بہانہ سازیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ ادھر تعلیم کا معیار بلند ہوا ادھر قومی زبان کے رسالوں اور اخباروں کو ان کا صحیح مقام ملا۔ کیونکہ جب سے

انگریزی اخبارات و رسائل کو "تہہ تیغ" کیا گیا تھا وہ سارے اشتہارات جو وہ لے اُڑتے تھے اب قومی زبان کے اخبارات و رسائل کے حلقوں میں گشت کر رہے تھے۔

طوائفوں کی بحالی کے سلسلہ میں اہم نوعیت کے دوسرے قومی مسائل کی وجہ سے تاخیر ہوئی مگر جب سے مردوں کو گھروں میں تاڑ دیا گیا تھا ان کے ادھر منہ ڈ لانے اور عورتوں کو تنگ کرنے کا کوئی خدشہ ہی نہ تھا۔ بہرحال اب فرصت ملتے ہی دنیا کی اس مظلوم ترین عورت پر توجہ دی گئی۔ اس مظلوم ہستی کو معاشرے میں باعزت مقام دلانے کے لئے ضروری تھا کہ وہ ساری اصطلاحیں محاورے اور الفاظ جو اس بدنصیب کو ذلت کے گڑھے میں گرا کر لیبل کی طرح اس پر چسپاں کئے گئے ہیں عوام کے ذہنوں سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں، چنانچہ ملک کی تمام لغاتوں میں سے رنڈی، طوائف اور اس قسم کے دوسرے تمام الفاظ خارج کر کے لوگوں کو انھیں زبان پر لانے سے روک دیا گیا۔ البتہ وہ مرد جو ان کی دلّالی کے فرائض انجام دیا کرتے تھے انھیں بلا تامّل آنکھوں پر پٹی باندھے بغیر ایک قطار میں کھڑا کر کے گولیوں کی باڑھ ماردی گئی۔ عورتوں کی فوج کے دستے نے جو انہیں کیفر کردار کو

پہنچانے پر مامور تھا شیطانی قہقہے لگائے اور وہ جل ٹھنڈے ہوگئے۔

باوجودیکہ ان عورتوں کے ذریعہ معاش کا انتظام کردیا گیا تھا مگر ضرورت اس امر کی تھی کہ معاشرے میں ان کا وقار بحال کرنے کے لئے نام نہاد معزز خاندانوں کے مرد ان کے پلّے باندھ دیئے جائیں۔ اب جو لڑکیاں کم عمر تھیں ان کے سپرد تو وہی لونڈے کردیئے گئے جنھوں نے حال ہی میں پر پُرزے نکال کر اُن کے گھروں کے طواف شروع کئے تھے۔ البتہ ادھیڑ عمر کی عورتوں کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ کیونکہ ان سے دل بہلانے والے سارے بڈھے شادی شدہ اور دس دس بچوں کے باپ تھے۔ ان بڈھوں کی بیویوں کے کان میں جب یہ بھنک پڑی کہ ان کی مظلوم بہنوں کی زندگی سدھارنے کے لئے ایسے بڈھوں کی ضرورت ہے جو اپنی ساری بدافعالیوں کے باوجود مردوں کے معاشرے میں شریف اور معزز سمجھے جاتے ہوں تو انھوں نے اپنے اپنے بڈھے میاؤں کو "پُن" کرنے کا اعلان کردیا۔

اب جو "دان پُن" کا سلسلہ شروع ہوا تو ۹۹ فی صد ادھیڑ عمر کے ہرجائی مردوں کو انھیں عورتوں کے گھر ڈلوا دیا گیا جہاں وہ کبھی دل بستگی کی خاطر تشریف لے جایا کرتے تھے۔

ادھر وہ بچاری نیک عورتیں ان بڈھوں کو دیکھتے ہی بدکیں کہ پھر یہ منحوس انھیں ورغلانے آگئے۔ پچھلے تجربوں کی بنا پر انھیں ڈر تو یہی تھا کہ کہیں یہ لوگ دوبارہ انھیں شادی کے جال میں پھنسا کر ان کا روپیہ پیسہ چھین کر انھیں پھر ذلت کے اندھیرے کنوئیں میں دھکا نہ دے دیں۔ چنانچہ سرکاری طور پر یقین دہانیوں کے باوجود بھی وہ انھیں اپنے گھروں میں رکھنے پر راضی نہ ہوتی تھیں۔ آخر پولیس کی اعلیٰ عہدیدار خاتون کو ان لوگوں کے نام تھانوں میں رجسٹرڈ کرنے اور ان کے چال چلن پر نظر رکھنے کا حکم دینا پڑا۔ اس قدر پکا کام کروانے کے بعد کہیں جا کر وہ انہیں اپنے گھروں میں ڈالنے پر رضامند ہوئیں۔

آخر عورتیں بہت جلد ماحول کی اس یکسانیت سے گھبرا اٹھیں صبح شام وہی ایک صورت، وہی ایک کھینچی نما ٹیڑھی لونڈا، جو اُن کے پلے بندھ گیا تھا ہر وقت ان کی صورت پر سوار، جان کا آزار بن کر رہ گیا۔ دنیا میں ہزاروں خوب صورت نہ سہی، اینڈے بینڈے، چھوٹے موٹے، ٹیڑھے میڑھے لڑکے تو موجود تھے مگر ان کی قسمت میں وہ اینڈے بینڈے بھی نہیں تھے۔ اب ایسی بھی گئی گزری نہ تھیں کہ زیادہ نہیں تو دو چار لڑکے ہی دل بہلانے کو پال سکتیں مگر مسئلہ تو یہ تھا کہ دل بہلانے کے لئے یہ لڑکے آئیں کہاں سے،

انھوں نے خود ہی تو ان اللہ ماروں کو گھروں میں یوں تاڑ رکھا تھا کہ کیا مجال جو ان نامنجاروں کی کہیں جھلک بھی پڑ جائے۔ لے دے کر مردوں والے ہتھکنڈے نظر آتے تھے مگر وہ مردوں کی طرح غلیظ تو تھیں نہیں کہ پھر سے غلاظت اور تعفّن پھیلانے لگتیں۔ اب کیا کیا جائے، گھروں سے اُکتاہٹ اور بدّدلی کی رو نے سارے دفتر کی عورتوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر محکمہ اور ہر دفتر میں یہی چرچے تھے کہ اگر جلد ہی فضا کو پر سکون اور خوشگوار بنانے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا تو کارکردگی میں نمایاں کمی کا اندیشہ ہے۔

آخر بڑی حکمت عملی سے کام لے کر یہ فیصلہ کیا گیا کہ مردوں اور لڑکوں پر ہر قسم کی ملازمتوں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ یہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ تھا۔ یعنی ایک تو اپنے ہی گھروں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ تمام دفتروں میں جو بددلی پھیل رہی ہے اس کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو جائے گا۔ اس فیصلے پر ساری عورتیں عش عش کر اٹھیں۔

کچھ دن کے بعد جس دفتر میں دیکھو دو چار لونڈے بنے ٹھنے بیٹھے نظر آنے لگے۔ دفتری کام وام تو خیر وہ کیا کرتے، البتہ اپنی اداؤں اور نازنخروں سے عورتوں کو لبھانے، رجھانے کا کام بحُسن وخوبی

انجام دینے لگے۔

نوجوان لڑکیوں کی تو بن آئی وہ جلدی جلدی اپنا کام نبٹا اُن کے گرد جمع ہو جاتیں۔ ہنسی مذاق دل لگی سے لے کر ڈھول دھپّے تک نوبت پہنچ جاتی مگر وہ پھر بھی تشنگی محسوس کرتیں۔

کچھ شرافت مآب قسم کی خواتین پہلے تو لونڈوں کی ان حرکتوں کو قابلِ اعتراض نظروں سے دیکھتی رہیں مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے اعتراضات درخورِ اعتنا ہی نہیں اور وہ خواہ مخواہ اپنی بد ذوقی کا ثبوت دے رہی ہیں تو انھوں نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں ہی عافیت سمجھی۔

اب جو رنگ رلیوں کا دور شروع ہوا تو سارے دفتر عیاشیوں کے اڈے بن گئے۔ ہر ایک ٹھپہ مارکہ افسر نے ایک اک لڑکا اپنی تفریح کے لئے مخصوص کر لیا۔ مگر مزے تو خاص فرمہ کے ڈھلے نام نہاد افسروں کے طبقے کے تھے جنھوں نے اپنے عہدے کے زعم میں لوگوں کی ناک میں نکیل ڈال رکھی تھی یہی وجہ تھی کہ اس طبقہ کے لئے اپنے مخصوص مال کے علاوہ دن دہاڑے باہر سے بھی مال کی سپلائی جاری تھی۔ پھر وہ خود کیونکہ حاکمِ اعلیٰ تھیں اس لئے کوئی ان کا نوٹس لینے والا نہ تھا۔

"ارے بھئی نوکری کرنا ہے تو یہ سب سہنا ہوگا۔" وہ بڑی ڈھٹائی سے انھیں ٹکا سا جواب پکڑا دیتیں۔ چنانچہ ضرورت مند لڑکوں کی جان ضیق میں آئی ہوئی تھی مگر کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا۔ اپنی مجبوریوں کی بدولت وہ اپنی درگت بنواتے، اور سسکی بھی نہ بھرتے۔

شہ پر شہ ملتی رہی اور عورتیں روز بروز شیر ہوتی گئیں۔ دفتروں کے بعد انھوں نے اسمبلیوں میں مردوں کی نمائندگی کا پاکھنڈ بکھیرا۔ سارے مرد بڑی آسانی سے اس جال میں پھنس گئے۔ بچاروں کا خیال تھا کہ یہ جو دفتروں، بازاروں میں ان کی درگت بن رہی ہے۔ اسمبلیوں میں پہنچ کر وہ اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ مگر صاحب توبہ کیجئے وہ ان کے چلتروں سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے۔ عورتوں نے تو محض اپنی تفریح کی خاطر انھیں اسمبلیوں کا راستہ دکھایا تھا۔ لابی اور گیلریوں میں تو وہ ان کی درگت بناتی ہی رہتی تھیں مگر اسمبلی کے بھرے اجلاس میں فضا کی بے کیفی دور کرنے کے لئے ان کا وجود ضروری تھا۔ جب کبھی کوئی پھبتی، کوئی فقرہ، کوئی ذومعنی لطیفہ وہ اپنی ہم جنسوں پر استعمال کرتیں تو ایسا دنداں شکن جواب ملتا کہ طبیعت منغض ہو کر رہ جاتی۔ پھر اتنی ساری ہم جنسوں سے ملنا

بھی آسان نہ تھا، لیکن چار چھ لڑکوں اور دو چار مردوں پر پھبتیاں کس کر وہ انتہائی لطف لیتیں۔ تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے کم بختوں میں دوبدو مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہ تھی۔

ایک دن اسمبلی کے بھرے اجلاس میں کسی عورت نے قومی زبان کا یہ شعر پڑھا ع

وہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

مطلب یہ تھا کہ اپنے طبقہ کو ان کی بے حسی اور کج روی پر غیرت دلائی جائے۔ شعر پڑھنے والی خاتون نے اب جو فضا کا جائزہ لیا تو حالات ناسازگار دکھائی دیئے۔ ساری عورتوں کے تیور بدلے ہوئے اور مرنے مارنے پہ تلی نظر آئیں۔ مارے ڈر کے قریب تھا کہ محترمہ کی گھگھی بندھ جاتی، معاً انھیں ایک ترکیب سوجھی۔

"ارے بھئی خواتین صبر سے کام لیجیے، ذرا اس شعر کا مطلب تو سنیے" جھنجھناہٹ کم ہوئی تو انھوں نے پینترا بدلا "بھئی اس شعر کا مطلب یوں ہے"

"ہی ہی ہی" پہلے انھوں نے اپنی باریک آواز میں خوب ہی ہی کی جب ذرا ان کی "گریہ نما" ہنسی تھمی تو مطلب ارشاد ہوا۔

سنئیے شاعر کہتا ہے کہ "سارے خوب صورت مرد لفنگے اور بدمعاش نہیں ہوتے، جس طرح سارے لفنگے اور بدمعاش مرد خوبصورت نہیں ہو سکتے۔"

شرم! شرم، مردوں نے اپنی بے سُری آواز نکالی، مگر نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ تمام عورتوں نے اپنے قہقہوں سے ایوان سر پر اٹھا لیا اور آناً فاناً ممبر خواتین کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہو گئی تھی ختم ہو گئی

پھر اسی پر بس نہ تھا عورتوں کی "خباثتیں" ہر گھڑی نیا چولا بدل کر سامنے آ رہی تھیں۔

اب وہ کھلے عام بسوں میں بازاروں میں، ہوٹلوں میں اپنے دفتر اور دفتر سے باہر نظر آنے والے لڑکوں سے اپنے رومانس کا چرچا کرتیں اخباروں اور رسالوں کے اشتہارات میں مردوں کی عجیب و غریب انداز کی تصویریں چھپتیں۔ مردوں کے لئے عریاں قسم کے نت نئے فیشن ایجاد کیے جاتے اور لباس اور دواؤں کے اشتہارات میں ان کی ٹیڑھی میڑھی شکلیں چھاپی جاتیں۔ ہر فنکشن اور ہر جلسہ میں تفریحی مد کے طور پر انھیں بلا کر سامنے کی کرسیوں پر بٹھا دیا جاتا۔ غیر ملکی سفارتخانے کی عہدیدار عورتوں کے پاس انھیں جاسوسی کی غرض سے بھیجا

جاتا تاکہ وہ اپنی اداؤں سے انھیں مدہوش کر کے ان سے سارے راز اُگلوالیں۔

بچارے مرد اپنی یہ دُرگت اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھتے پر زبان سے اُف نہ کر سکتے تھے۔ اور کہتے بھی کیا! انہیں بخوبی علم تھا کہ آج وہ جس خاردار راستے پر چلنے پر مجبور ہیں اس پر کانٹے انھیں کے بوئے ہوئے ہیں۔

# مشورہ حاضر ہے

اب آپ سے کیا چھپانا۔ سچ بات ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ میں آج کل بے کار ہوں، بے کاری سے حواس باختہ ہو کر ویسے ہی انسان کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ اس لئے جملہ ہمدرد اور غم گسار اپنے اپنے تجربات پیش کر کے نئی نئی راہیں سجھاتے رہتے ہیں۔ طرح طرح کے مشورے لوگوں کے منہ سے یوں پھوٹے پڑتے ہیں جیسے بہار کے موسم میں کونپلیں اور شگوفے۔

"کیا کر رہی ہو؟" شکل دیکھتے ہی سوال ہوتا ہے۔

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اک دم ذہن میں روشنی سی پیدا ہوتی ہے، واقعی ایسا انوکھا خیال اب تک اپنے کم بخت دماغ میں کیوں نہ آیا، ورنہ بیڑا پار نہ ہو جاتا۔ بروقت کیسی مناسب رہبری کی ہے، نیک بخت نے! دل کی کلی کھلنے سی لگتی لیکن ملازمت کے امکانات پر غور کرتے ہی وہ تمام دُھتکاریں اور دھکے یاد آجاتے ہیں جو پچھلے سال اس شوق کی بدولت نصیب ہوئے تھے اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

"کہاں کام کر رہی ہو؟"۔ پھر اک سوال ہوتا ہے۔ دل چاہتا کہ میں کہیں جھک مار رہی ہوتی تو جھٹ سے بتا تو دیتی اور عین وقت پر بے روزگاری کی شرمندگی تو اٹھانی نہ پڑتی۔

"کسی اسکول میں نوکری کیوں نہیں کر لیتیں؟ ........ ٹریننگ ...... ٹریننگ تو ہو گی"۔ کس قدر سہلا سہلا کر وہ یہ معلوم کر رہی تھیں کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

"ٹریننگ کوئی نہیں ہے"۔ آخر انھوں نے اُگلوا کر چھوڑا۔

"لے لیجئے نا ٹریننگ ..... مستقبل بن ....."

بیشتر اس کے کہ وہ مجھے روشن مستقبل کی جھلکیاں دکھائیں دماغ بھنّا اٹھتا ہے، مارے کوفت کے بخار سا چڑھنے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ہتھوڑا لے کر نہ سہی تو کم از کم ایک دھموکا ہی جڑ کر پوچھوں کہ تم

سے کس نے مانگا ہے یہ احمقانہ مشورہ! ٹالنے کو تم لنا ہی نہیں سمجھتیں اور بڑھے چلی جاتی ہیں۔ مگر پھر وہی روایتی مصلحت اندیشی آڑے آتی ہے اور خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہونا پڑتا ہے۔ آخر مارے جلن اور گھٹن کے گھر سے نکلنا بند کر دیا کہ بلا سے نہ کسی سے ملیں گے اور نہ کوئی اپنے قیمتی مشوروں سے نوازے گا۔

کچھ دن اس ترکیب کی بدولت خاصا امن رہا۔ مگر اپنی طبیعت کو بھی قرار کہاں، دوستوں کی محبت نے چین سے بیٹھنے ہی نہ دیا۔ ناچار پرسشِ احوال کے لئے خط و کتابت کا سلسلہ جمایا۔ اپنی طرف سے تو خطوط کا انداز اتنا فلسفیانہ اور مدبرانہ رکھا کہ افلاطون اور ارسطو دیکھ پائیں تو اپنی چوکڑی بھول جائیں۔ کیا مجال جو کسی خط سے بے اطمینانی یا مالی پریشانی مترشح ہو مگر تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے، دوستوں نے فلسفہ پڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو۔ آخر دنیا دیکھی تھی۔ سمجھ ہی گئے کہ ہم کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں یعنی یہ بلند پروازی خالی پیٹ کی غماز ہے!۔ اب جو مہربانوں کی محبت نے جوش مارا تو چلا آرہا ہے ایک خط انتہائی بوکھلائے انداز میں مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"فوراً اپنے نام سے ایک کارپوریشن رجسٹر کرا کے اس کا لیٹر پیڈ چھپوا لو۔ میں تمہیں فلاں فرم کا "سول ڈسٹری بیوٹر" مقرر کرا رہا ہوں۔

انشاء اللہ اس سے کافی آمدنی ہوگی"۔

اب تک تو ان "انگلش نژاد" کاروباری اصطلاحوں سے کوئی واسطہ ہی نہ پڑا تھا اب جو یوں لیکایک سر پر نازل ہوئیں تو میں بھونچکا رہ گئی۔ مطلب واضح ہوا تو حیرانی اور بڑھی۔ سوچا شاید دوست کو میری عقل کا امتحان مقصود ہو ورنہ کاروبار سے اس "ہیچ مداں" کو کیا نسبت!۔ ہر پھر کر یہی نکتہ اپنی عقل سے بالا تھا کہ اگر یہ بلاشرکت غیرے قسم کی ایجنسی ایسی ہی سونے کی کان ہے تو ماہرین کاروباری کہاں ناپید ہو گئے جو کنوؤں میں بانس ڈال کے اس ذرۂ ناچیز کو عدم سے وجود میں لایا جا رہا ہے۔

خط کے مضمون سے اس درجہ تیقن اور اعتماد کا اظہار ہوتا تھا کہ مزید پوچھ گچھ کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کہیں دوست کی خودداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔

ادھر سے جملہ ہدایات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ صرفہ کا خیال نہ کرنا، اس لئے نہ کیا اور جملہ انتظامات مکمل کر کے اللہ کی چھپر پھاڑ دین کا انتظار کرنے لگی مگر بیچارے دوست مجبور ہو کر رہ گئے چونکہ بلاشرکت غیرے ایجنسی عنایت کرنے والی فرم کم بخت بڑی چالاک نکلی۔ عین وقت پر کھٹکی میں سے نکل گئی۔

کچھ دن ہمدردی کے محاذ پر سناٹا رہا۔ آخر ایک عزیز انگلستان کی ہوش رُبا رنگینیوں سے دامن چھڑا کر اُفق پر نمودار ہوئے۔ طبیعت کھل اٹھی۔ سوچا لڑکا ساری دنیا چھان کر آ رہا ہے ضرور کوئی اچھی راہ سُجھائے گا۔ مگر صاحبزادے بلند اقبال پر اور ہی نشہ سوار تھا۔ بیرسٹری کی سند انگلستان کی رنگ رلیوں کی نذر کر کے اب ان پر فکرِ معاش کا بھوت سوار تھا۔ سارا یورپ کھنگال کے ہوٹل چلانے کا معزّز ترین پیشہ ان کو بھا گیا تھا۔ دن رات اس فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ کب جدّی جائداد فروخت ہو، اور وہ واپس جا کر وہاں کے لوگوں میں مشرقی کھانوں کا صحیح مذاق پیدا کریں۔ ایک روز کھانے کے دوران جوش میں آ گئے۔

"انگریزوں کو کبابوں کی چاٹ تو لگ ہی چکی ہے مگر اب تک عُمدہ قسم کے کباب وہاں تیار نہیں ہوتے۔ اگر یہ کباب وہاں میسّر آ جائیں"، انھوں نے کبابوں کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا "تو وارے نیارے ہو جائیں"۔

"پھر کیا ارادہ ہے؟"

"سوچتا ہوں واپس جا کر یہی دھندا شروع کر دوں!"۔

"عمدہ خیال ہے! پڑھیں فارسی بیچیں تیل!" میں نے چوٹ کی۔

وہ مسکرائے "سنیے کیوں نہ آپ بھی چلیں نفع بخش کاروبار ہے صرف دیکھ بھال آپ کے ذمّے"

"میں؟ ..... یعنی کہ میں؟"۔ اس معززہ عہدہ کی پیشکش پر میں تلملا کر رہ گئی۔

ایک روز شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک دوست کا گھر نظر پڑا، سوچا دس منٹ آرام لے لیں۔ اس بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی مدتیں گزر گئیں کیونکہ وہ بھی تلاشِ معاش میں مبتلا تھیں۔ اس لئے کسی بے تکے مشورے کا اندیشہ ہی نہ تھا ان سے اپنی ہی نہیں نبیڑی جا رہی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ایک نامانوس شکل نظر پڑی۔ میرا ماتھا ٹھنکا خدا خیر کرے۔

رسمی تعارف کے بعد وہی سوال کہ کیا کر رہی ہو؟

"یہ ہاں۔ یہ بھی میری طرح بے کار ہیں"۔ شریکِ حال دوست نے میری ترجمانی کی۔

"ارے واہ!" وہ کھِل اٹھیں۔ "پھر تو بہت ہی اچھی بات ہے تم دونوں مل کر میرے درزی خانہ میں کام کرو"۔

میری دوست کا منہ لٹک گیا، اپنی جگہ میں بھی لرز اٹھی، لیکن وہ گرد و پیش سے بے نیاز اپنا راگ الاپے جا رہی تھیں!

"میں عنقریب اپنے یہاں بچوں کے لباس کا ایک شعبہ قائم کر رہی

ہوں۔ تم لوگوں کا کام انتہائی آسان، صرف آرڈر لانا ہوگا۔"

ہماری خاموشی سے کبیدہ خاطر ہوگئیں۔

"ارے بھئی سوچ لو۔ میں تو تمہارے فائدہ ہی کی کہتی ہوں۔"

واقعی انتہا تھی یہ ہمدردی کی، اس قدر بروقت ملازمت مہیا کرنا تو کسی دفتر روزگار کے بس کا بھی نہ تھا۔

مشوروں کی اس یلغار نے ایک بار پھر مجھے گھر کی چہار دیواری میں محصور کر دیا مگر "ہونی شُدنی" ہو کر رہی۔

عزّت مآب ایک بزرگوار میری حالت زار کے معائنہ کے لئے پنج سالہ دورہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ مدتِ مقررہ پر آن وارد ہوئے، باوجودیکہ حضرت نے ملکی اور غیر ملکی کئی سندیں ہتھیار رکھی تھیں مگر عقل و خرد واجبی ہی واجبی تھی۔ زندگی کو روپے پیسے کے پیمانے سے ناپتے ناپتے فلسفی بن گئے تھے۔ ان کی زندگی کا حاصل ایک ہی مقولہ تھا کہ "بینک بیلنس بہترین ٹانک ہے۔" اس ایک مقولے میں انھوں نے ساری دنیا کے عاقبت اندیشوں کے لئے راہ عمل متعین کر دی تھی۔ عام طور پر ان سے ضابطہ کی دو چار بندھی ٹکی باتوں کے بعد سلسلۂ کلام منقطع ہو جاتا۔ پر اس روز ان کا دماغ بلند پروازی کی طرف مائل تھا۔

"ارے بھئی کدن میاں کے لئے کوئی لڑکی تو بتاؤ!"

"لڑکی"۔ سوال انتہائی غیر متوقع تھا

"ہاں بھئی! یہ تو تمہارے ہی کرنے کا کام ہے"۔ انھوں نے زندگی میں پہلی بار میری اہلیت تسلیم کی، واقعی اس کے سوا مجھے اب اور کام بھی کیا تھا، یہ بھی ان کی عزت افزائی تھی کہ وہ مجھے اس "پیوندکاری" اور "شجرکاری" کی قسم کے کام کا اہل سمجھ رہے تھے۔ ورنہ اس نازک معاملہ میں ان کی اپنی فلاسفی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

"کتنے پیسے دیں گے؟" میں نے طنزاً کہا

"جو تم مانگو!" وہ حماقت کی حدوں کو چھو رہے تھے۔

"جو میری بات مانو" انھوں نے ایک منٹ توقف فرمایا "تو ایک شادی کا دفتر ہی نہ کھول لو بڑا نفع بخش کاروبار رہے گا"

کھٹ —— معلوم ہوا سر میں کسی نے پتھر دے مارا۔ میں بھناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

# میرے بعد

جونہی میرے انتقال پُر ملال کی خبر دفتر میں پہنچی ایک منٹ کے لئے تو وہاں بھی افراتفری مچ ہی گئی۔ سارا عملہ خبر سنانے والے کے گرد جمع ہو گیا۔ دفتر میں جلد پہنچنے والوں نے دیر سے آنے والوں کو یہ خبر سنانی شروع کی۔ سننے والے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔

ایک صاحب اس خبر کو سنتے ہی پی گئے۔ دراصل وہ اس ناگہانی حادثہ سے خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ زندگی کی بے ثباتی کا خیال بار بار ان کے ذہن میں سر اٹھاتا جسے دبانے کے لئے وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ۔۔۔ موت کے تصوّر سے

اچھے خاصے سخت دل لوگوں پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ تو ویسے ہی نرم دل تھے۔ اس وقت انھیں اپنی عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ ان اچانک مرنے والوں کی آئے دن کی خبروں نے زندگی کا اعتبار بالکل ہی کھو دیا تھا۔

"کیا خیال ہے آپ کا؟" مضبوط دل کے ایک صاحبزادے نے جمود توڑا۔ وہ رائے عامہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔

"کس بارے میں؟" ان کے مخاطب انجان بن گئے۔

"یہی مرحومہ کے بارے میں" آخر سوال کرنے والے کو وضاحت کرنی پڑی۔

"جی ہاں صاحب"۔ وہ اب بھی اس موضوع کو چھیڑنا نہ چاہتے تھے۔ "بڑا اچانک حادثہ ہوا صاحب۔ یقین نہیں آتا۔"

سخت دل صاحبزادے اس وحشت ناک موضوع کو جاری رکھنے پر تُلے ہوئے تھے۔ مگر اپنی بات کا جواب نہ پا کر اخبار دیکھنے لگے کام کی وحشت ان پر بھی سوار تھی۔ انھوں نے اخبار اُلٹ پلٹ کر ذہن کو بہتیرے جھٹکے دیئے مگر یہ واقعہ ان کے ذہن سے اب بھی نہ نکلا۔

"کچھ نہیں صاحب بڑی مایوسی ہوئی"۔ وہ آخر چپ نہ رہ سکے۔

"کس بات سے؟" ان کے مخاطب چونکے۔

"یہی کہ مرحومہ کے مزاج میں شدت پسندی بہت تھی"۔ مخاطب کو تبصرے کے لیے مصرعِ طرح دیا گیا۔

"ہاں صاحب یہ بات تو تھی"۔ آخر مخاطب کھلنا شروع ہوئے۔

"طبیعت میں بے جا احساسِ تفاخر تھا۔ کل ہی کس فخر سے انھوں نے ہمارے ایک محاورے پر اعتراض کیا تھا۔ حالانکہ بات معمولی تھی" انکے ذہن میں وہ واقعہ ابھی تک تازہ تھا۔ جب میں نے بڑی نیازمندی سے ان کے ایک غلط محاورے کی تصحیح کر دی تھی۔ جان بوجھ کر وہ بات کو غلط رنگ میں پیش کر رہے تھے۔

ایک اور صاحب ان کے قریب ہی اس تمام حادثہ سے بے نیازانہ اخبار کے مطالعہ میں منہمک تھے۔ انھوں نے پوچھ گچھ کی ضرورت محسوس کی اور نہ کسی تبصرے کی۔ وہ زندگی اور موت کے اس ڈھونگ سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک معمولی واقعہ تھا۔

"قہ۔قہ۔قہ ہے۔ ہے ہے تو یہ بات ہے آخر کو محترمہ چل دیں"۔ ایک صاحب نے اس انداز سے اپنی موٹی آواز میں قہقہے لگانے شروع کیے گویا بڑا پُرلطف واقعہ بیان فرما رہے ہوں۔

ایک رسالے کے مالک۔ میرے مرنے کی خبر پر بھی ناراض ہو گئے۔

"اونہہ، وہ مضمون لکھنے اور اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ذرا دم خم تو دیکھو کہ اپنا پہلا ہی مضمون ہمارے رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ پر میں نے وہ مضمون شائع ہی نہ کیا۔ رہ گئیں اپنا سا منہ لے کر۔ خدا بھی قد دیکھ کر جامہ بونتا ہے اس نے پنپنے ہی نہ دیا۔ شکر ہے کہ ان کی لایعنی خرافات کا خطرہ تو ٹلا۔"

"ارے ہاں نہ جانے کب پھر آن ٹپکتی؟" تصدیق کے لئے انھوں نے اپنے تازہ شمارے کی ورق گردانی کی جس میں میری کوئی لغویت شامل نہ تھی اور اطمینان کا سانس لے کر رسالہ رکھ دیا

میرے محلہ والوں نے اس خبر کو سنتے ہی ناک بھوں چڑھا کر تبصرے شروع کئے۔

"عجب بے حس عورت تھی اور گھنی تو اس قدر کچھ ہی کہے جاؤ بولتی ہی نہ تھی۔" پچھواڑے والی ہمسائی بڑی محبت سے مجھ پر پھٹکار برسا رہی تھیں ان کے ذہن میں وہ واقعہ کلبلا رہا تھا جب بچوں کی لڑائی کو میری سازش قرار دے کر انھوں نے میرے باپ دادا تک پُن ڈالے تھے۔ بعد میں یہ واقعہ قطعاً ان کے دماغ سے ... محو ہو چکا تھا۔ لہٰذا ہمیشہ میری سرد مہری کی شاکی رہیں کہ ہمسایوں سے ناراضگی کیسی!

"اے خدا کی قسم" ایک اور ہمسائی نے اپنی بھینچی ہوئی آواز نکالی "ہم تو کبھی اس عورت کے گھر سے کسی چیز کے بھی روادار نہ ہوئے کبھی یہ بچے ہی تولیہ۔ چمچے اور لیٹر پیڈ مانگنے چلے جاتے تھے تو خدا کی قسم فوراً واپس دے آتے تھے۔ دل کی بڑی چھوٹی تھی۔ خدا کی قسم"۔ تین بار خدا کی قسم کھانے کے باوجود انھیں اپنی بات کا خود ہی یقین نہ آ رہا تھا۔ اس وقت وہ سب چیزیں ان کی نظروں میں گھوم رہی تھیں جنھیں مانگ کر وہ کبھی واپس نہ کرتی تھیں۔

"ارے چھوڑو۔ نری بد دماغ عورت تھی کسی سے ملنا جلنا پسند ہی نہ تھا" ساتھ والی ہمسائی میری کم ظرفی سے نالاں تھیں، ان بچاری نے تو بڑی اپنائیت سے میرا ملازم ہتھیا لیا تھا یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ذرا سی بات کو یوں گرہ میں باندھ لوں گی۔

"اے ہم نے تو ان سے بہتیرا ملنا چاہا مگر وہ تو آدم بیزار عورت تھی۔ کبھی سامنے تو پڑتی ہی نہ تھی"۔

ایک اور ہمسائی دوسروں کے سامنے معصوم بنی حیران کھڑی تھیں۔ ان کی حیرانی بجا بھی تھی سارے محلے پر اپنی چودھراہٹ کا سکہ جمانے کے بعد جب وہ میری طرف ملتفت ہوئیں تو میں نے بے رُخی اختیار کر لی۔ دراصل مجھے ان لڑائی جھگڑوں سے سخت

نفرت تھی جن میں وہ اپنی لگائی بجھائی کی بدولت بی جمالو کا کردار ادا کیا کرتی تھیں۔

ایک عزیز دوست یہ خبر سنتے ہی بدحواس ہو گئے اضطراری طور پر ان کا ہاتھ اس رسالے کی طرف اٹھ گیا جس میں حال ہی میں میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ رسالہ پر جمی ہوئی گرد کو انھوں نے آہستہ سے جھٹکا مضمون والا صفحہ نکالا۔

"ارے توبہ"۔ ایک دم ان کی طبیعت منغّض ہو گئی۔ "اگر ذرا سی اس مضمون میں تبدیلی ہو جاتی تو کتنا نکھر آتا۔ بارہا جتایا مگر یہ عورتیں ناقص العقل ہونے کے ساتھ ضدّی کتنی ہوتی ہیں!"

انھیں اس مضمون کے چند جملوں پر اعتراض تھا۔ جنھیں وہ میری زندگی میں ہی تبدیل کروانا چاہتے تھے۔ آئندہ تبدیلی کا امکان باقی نہ رہنے سے وہ پریشان ہو کر رہ گئے۔

اسی بات سے چڑ کر انھوں نے میری زندگی میں اس مضمون کا مطالعہ نہ فرمایا تھا اب جبکہ مرنے والے کی ایک اک چیز عزیز ہو جاتی ہے وہ اس مضمون پر التفات فرمانا چاہتے تھے مگر یہی چند جملے اُن کے مطالعہ میں حائل ہو رہے تھے۔

دوگونہ پریشانی کے عالم میں وہ رسالہ پٹخ کر گھر سے باہر نکل گئے۔

ایک دو ہفتہ کے بعد یہ خبر خاصی پھیل گئی جن لوگوں نے اس حادثہ کو مفید مطلب پایا وہ اسے لے اُڑے۔

میرے شوہر کی کتابوں کے پبلشر کے حواریوں کو خوشنودی حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ "سنا آپ نے قبلہ ...... کی بیوی بھی چل بسی"۔

"اچھا" آواز میں انتہائی مسرت تھی۔

"پچھلے ہفتے آپ نے بتایا تھا کہ رائٹرز گلڈ کے ذریعے انھوں نے آپ کو نوٹس دے کر پریشان کرنے کی کوشش کی تھی"۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ارے صاحب اس میں خدانخواستہ میرے لئے پریشانی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس کاروبار میں تو یہ معمولی بات ہے"۔

"مگر اب تو وہ جھگڑا ہی مٹا"۔ کہنے والے نے پچھلی بات کی تلافی کی۔ "مگر سنا ہے ان کے بچے وچے بھی ہیں"۔ وہ تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ پورے طور سے خطرے سے باہر ہو چکے ہیں یا نہیں۔

"ارے صاحب نہیں۔ ہوا کریں بچے۔ وہ آپ کے دشمنوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ بچے اگر ہیں بھی تو انھیں ہوش آتے آتے وقت لگے گا۔ اصل خطرہ تو ان کم بخت مصنفوں اور ان کی بیویوں سے ہی ہوتا ہے ان میں سے اگر ایک مرتا بھی ہے تو دوسرا سر پہ آن دھمکتا ہے صاحب معاملہ ہوتے ہیں نا!

"چھوڑیئے صاحب ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے"۔ ان کی گرجدار آواز سے مخاطب بھی سہم گئے اور ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد ٹل گئے۔

ان کے رخصت ہوتے ہی پبلشر صاحب نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا جو پہلے ہی ندارد تھیں۔ منشی جی! منشی جی! مارے خوشی کے انھیں یاد ہی نہ رہا کہ وہ ان کے قریب ہی بیٹھے ہیں۔

"سنا آپ نے؟"

منشی جی بدحواس ہو کر مالک کے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ وہ بچارے اب تک اس مسرت انگیز خبر کی کڑیاں ہی نہ ملا پائے تھے۔

"ارے اپنی راہ کا ایک اور کانٹا نکل گیا۔ دیکھا آپ نے اس کی بیوی بھی چل دی۔ یاد ہو گا آپ کو چھ سات ماہ قبل کا واقعہ.. کہ کس طرح اس عورت نے اپنے شوہر کی کتابوں کی رائلٹی وصول کرنے کے لئے ہمیں تنگ کیا تھا"۔

"جی ہاں! جی ہاں! مگر وہ کچھ وصول تو نہ کر پائی تھی"۔

منشی جی ضعف دماغ کی وجہ سے اب بھی پورا واقعہ یاد تو نہ کر پائے تھے۔

"لاحول ولاقوۃ! اور کیا تمہارا مطلب ہے وہ ساری دکان ہی

لوٹ کر لے جاتی۔ چار ہزار میں سے چار سو روپے تو اس نے وصول کر لیے اور آپ کہتے ہیں کہ اس نے کچھ وصول ہی نہ کیا۔ وہ تو اگر عین وقت پر مجھے یہ بات نہ سوجھتی کہ کتاب کی فروخت سے قبل پوری رائلٹی وصول کرنے کی صورت میں میرے نقصان کی وہ ذمہ دار ہو گی تو تین ہزار روپے گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ہر جا سمجھ کے بہانے یہ رقم اس عورت سے بچائی تھی۔

"مگر اب تو ان کا اپنی طرف کوئی حساب باقی نہیں"۔ منشی جی کے لہجے میں شک تھا۔ "دیوانے ہوئے ہو۔ جاؤ سجا کر حساب چیک کرو۔ میں نے اسے صرف چار سو روپے دے کر حساب بے باق کی رسید وصول کر لی تھی۔ دیکھو وہ رسید بحفاظت موجود ہے"۔

رسید دیکھ کر جان میں جان آئی تو انہیں خوش گپیاں سوجھیں۔ "یاد ہے منشی جی جب اختر شیرانی کا انتقال ہوا تھا تو کتنی آمدنی ہوئی تھی ہمیں؟"۔

"نو ہزار نو سو پچاس روپے"۔ حساب کتاب کے ماہر منشی جی نے فوراً صحیح رقم گنائی۔

"ہاں بھئی اس روز پریس والوں نے بھی اپنا خوب ساتھ دیا تھا۔ ہمیں اس شاعر کے مرنے کی خبر کوئی دس بجے رات کو ملی تھی اور

صبح شہر کے کونہ کونہ میں اس کی کتابوں کے اشتہار چسپاں تھے۔ پھر جو دوپہر سے کتابوں کی فروخت شروع ہوئی ہے تو تمہیں پتہ ہی ہے“۔

”بڑی دردناک موت تھی وہ“ منشی جی نے جواں مرگ شاعرہ سے ہمدردی کی۔

”حد ہے میں کاروبار کی بات کرتا ہوں اور تم مرنے والے کا مرثیہ پڑھ رہے ہو۔ ہماری موقع شناسی اور پھرتی کی تو داد نہیں دیتے کہ کس طرح ذرا سی معاملہ فہمی سے وہ ساری کتابیں آناً فاناً فروخت ہوگئیں۔ جو ہم نے ایک ہزار کے بدلے تین ہزار چھاپ لی تھیں“۔

”مگر اس میں ہمیں گھاٹا تو نہیں رہا۔ مصنف کو تو ہم نے صرف ایک ہزار کتاب کی رائلٹی پر ہی ٹرخایا“۔ مالک کے منافع کا خیال ہر دم منشی جی کے پیش نظر تھا۔

”اب چھوڑو ان باتوں کو مجھے تو اس وقت یہ خیال ستا رہا ہے کہ یہ عورت مرنے سے قبل کسی کتاب کی مصنف کیوں نہ بن سکی۔ ورنہ اس موقع پر کم از کم دو چار ہزار تو اپنے ہاتھ لگ ہی جاتے“۔

# یادداشت کے بغیر

"لاحول ولا قوۃ! کیا لغو حرکت ہے۔ میں نے خود کو تنبیہہ کی۔ تُف ہے اس بے دھیانی پر بھلا کیا سوچتا ہو گا وہ شخص ایسی بھی کیا غائب دماغی کہ دسیوں بار کی دیکھی ہوئی شکل ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے" میں دل ہی دل میں نادم خود پہ پھٹکار برسا رہی تھی اور صبح کا کنٹین والا واقعہ میرے ذہن سے محو ہونے میں نہ آتا تھا۔

عام طور پہ تو میں ملازمتوں کے ڈر سے کنٹین کے پچھلے دروازے سے داخل ہوتی اور اُسی چور دروازے سے خاموشی سے کھسک آتی تھی۔ پر اس روز شفیق صاحب سے مڈبھیڑ ہو

ہی گئی اور مجھے شرما حضوری ہال میں جانا پڑا۔ اس حد تک بھی صبر تھا مگر ہوا تو یہ کہ جب وہ چائے کا آرڈر دے کر کاؤنٹر سے مڑے تو ایک اجنبی صورت اُن کے ہمراہ تھی۔

"کیا مشکل ہے۔ میرا موڈ خراب ہونے لگا۔ نہ جانے کس ذات شریف کو سنبھالے چلا آرہا ہے۔ اب دونوں گھنٹوں میرا دماغ چاٹیں گے۔

آپ سے مل...... شفیق صاحب ابھی تعارف کی تمہید ہی باندھ پائے تھے کہ وہ پھٹ پڑے۔

"تعارف ہے۔ بندہ نواز...... تعارف"...... ان کے اس انکشاف پر مجھے حیرانی ضرور ہوئی مگر اس خیال سے خاموش ہونا پڑا کہ بعض بزعم خود خوش مزاج لوگ اس انداز سے اپنی خوش مذاقی کا مظاہرہ بھی تو کیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے آنجناب کی بھی یہی ادائے خاص ہو...... مگر جب وہ دونوں میرے سامنے والی نشستوں پر براجمان ہو گئے تو میرا دم گھٹنے لگا۔ دراصل مجھے ان خواہ مخواہ واقفیت جتانے والوں سے ہمیشہ ہی چڑ رہی ہے۔ بلا وجہ یوں سر ہو جائیں گے کہ جان چھڑانی دو بھر ہو جائے۔ اور پھر چھوٹتے ہی بے تکے پن کے مظاہرے...... جی چاہا کہ ایک بار تو پوری بداخلاقی سے وہاں

سے اُٹھ کر چل ہی دوں۔ پر نہ جانے کیوں اتنی بے تمیزی کی ہمت ہی نہ پڑی اور میں کرسی پہ ذرا سی اُچک کر رہ گئی۔

ادھر وہ دونوں میری اس ذہنی کوفت سے بے نیاز بات بات پر قہقہے اڑا رہے تھے۔ طبیعت منغض ہو تو ویسے ہی اچھی بھلی بات سمجھ میں نہیں آتی اور یہاں تو میں جان بوجھ کر سُنی ان سنی کر رہی تھی کہ کہیں وہ آپس میں گندے سندے لطیفوں کا تبادلہ نہ کر رہے ہوں۔ دراصل مجھ پر ان تمام بیہودہ لطیفوں کی ہیبت طاری تھی جو باذوق مردوں کی محفل میں نہایت ڈھٹائی سے ایک دوبارہ سننے پڑے تھے۔ گھبرا کر میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

ایک دم سے کئی آوازیں میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرائیں۔ کچھ کلیم الاٹمنٹ کا ذکر تھا۔ میں نے سوچا محکمۂ بحالیات کا ملازم ہے کوئی۔ مگر اس بے لطف گفتگو میں دخل اندازی کی مجھے کیا ضرورت پڑی تھی۔

"آپ کے کلیم کا معاملہ تو طے ہوگیا؟" اک دم نووارد کی گفتگو کا رُخ میری جانب تھا۔" اگرچہ اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی دخل اندازی مجھے پسند نہیں مگر رفعِ شر کے خیال سے سر ہلا دیا۔

"قسطوں کی ادائیگی کا تو کوئی قصہ نہیں"؟

"خوب!" میں نے سوچا خاصا جاسوس ہے۔ اب یہ دھیرے دھیرے مجھ سے گھر کی ہر بات ہی پوچھ ڈالے گا۔ مگر لڑنے کو دل ہی نہ چاہا اِس لئے صاف بات بتانی پڑی۔

"میں نے کوشش تو پوری کی تھی کہ آپ"........ "آپ نے کوشش"...... میں نے چاہا کہ اس خواہ مخواہ قسم کے ہمدرد کو جی بھر کے بے وقوف بناؤں۔"

"جی ہاں میں، میں کلیم آنیسر ہوں اور آپ کا نیم ــ"۔

"آپ کا اسم شریف"

میں نے سمجھا چور کے پاؤں کہاں اب تو پکڑا ہی جائے گا۔۔۔

"مجھے نصیر کہتے ہیں"۔۔۔۔۔۔

نام سنتے ہی میں سن سے ہی تو رہ گئی۔۔۔ "اچھا آپ..... ارے توبہ آپ...... معاف کیجئے آپ"۔۔۔۔ گھبراہٹ بس معذرت کے لئے مناسب الفاظ ہی نہ ملے۔

"بالآخر آپ نے مجھے پہچان ہی لیا"ــــــ اُس نے چوٹ کی۔

"میں تو پہلے ہی تعارف کروا رہا تھا"۔ شفیق صاحب بھی چُپ نہ رہ سکے۔

"میں نے آپ کو پہچان تو لیا تھا..... مگر"........

"مگر"...... وہ بات کو لے اڑا۔ مگر ابھی مزید پہچان
.... میں قہقہوں کے شور میں کھسیانی بنی بیٹھی تھی۔

اس واقعہ کے بعد بے دھیانی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔
دو چار بار نظر آنے والی ہر صورت کا میں نے توجہ اور غور سے جائزہ
لینا شروع کیا۔ کم از کم ملنے والے کے قد و قامت کو میں اپنے ذہن
میں ضرور محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی تاکہ یادداشت کو سہارا رہے
اور عین موقع پہ جواب تو نہ دے جائے۔

پر اس روز دفتر میں آنے جانے والوں نے وہ ہڑبونگ مچائی
کہ خدا کی پناہ۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے ویسے ہی ٹھونسم ٹھانس کا عالم
تھا اس پر ملاقاتیوں کی آمدورفت کا چکر، باتوں کی گنگناہٹ سے ذرا
جو یکسوئی نصیب ہوتی ہو میرے بازو والی میز ملاقاتیوں کا نشانہ
بنی ہوئی تھی۔ ایسے میں کیا خاک کام ہوتا۔ تنگ آ کر آنے جانے والی
شکلوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

اے ہے گنجا! میں نے جاتے ہوئے چیک کے کوٹ کو ذرا جو اوپر
تک دیکھا تو بے چارے کا سر بے آب و گیاہ میدان نظر آیا۔ پھر وہی
شکل —— ذرا دیر بعد چیک کا کوٹ واپس لوٹا۔ مگر..... مگر اب یہ
سر پہ بال کیسے ؟ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ تماشہ کیا ہے ؟

"سنیئے" میں نے اس کے جانے کے بعد اپنے ساتھی سے رازداری سے پُوچھا، "یہ کون ہے؟"

"آپ کے خیال میں کیا ہو سکتا ہے"؟

"میرے خیال میں تو وہ کوئی بہروپیا ہے"۔

"ہیں" وہ اک دم چونکا۔

"ہاں بھئی مجھے تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"۔

"کوئی وجہ؟"

"ارے بھئی! کبھی دیکھو تو چندیا پہ جنگل کا جنگل اور کبھی جناب چٹیل میدان"۔

"کون کسے کہہ رہی ہیں" ـــــ وہ چڑ گیا۔

"اس کو یہ جو ابھی آیا تھا"۔

"وہ تو حمید اور نسیم تھے"۔

"نہیں نہیں وہ جو کبھی فارغ البال نظر آتا ہے اور کبھی نہیں ـــــ" میں اسے مستقل گڑبڑانے پہ تلی ہوئی تھی۔

"خدا رحم کرے" وہ جھلایا۔

"ہاں بڑی ہی قابلِ رحم حالت ہے بچارے کی"۔

"نہیں جناب اس پر نہیں آپ پر آپ جو دو انسانوں میں فرق

نہیں کر سکتیں اور اچھے بھلے آدمیوں کو گڈمڈ کر رہی ہیں۔"

"میں؟" میں کیوں کرتی وہ ہے ہی ایسا۔"

"سنیئے" وہ اِک دم سنجیدہ ہو گیا۔" وہ ایک نہیں دو آدمی ہیں اور ان میں صرف ایک فارغ البال ہے۔"

"کیا؟ تو وہ وہ...... میں ہکلا کر رہ گئی۔

ایک روز راہ چلتے ایک طول و عریض جُثہ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹکا۔ مجھے بھی رکنا پڑا کچھ اس انداز سے انہوں نے پرسشِ احوال پہ کمر باندھی کہ اجنبیت کا شائبہ ہی نہ رہا۔ بچوں سے لے کر گھریلو معاملات تک ہر داستان انہیں ازبر تھی۔ میں کھمبا بنی کھڑی تھی مگر ان کا اور چھور سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

"کہیئے بچے تو خیریت سے ہیں؟"۔ اگرچہ کسی بچہ کی تفصیل یاد نہ تھی مگر پوچھا۔

"جی ہاں!" انہوں نے بے دلی سے جواب دیا۔

کچھ عقل کام نہ دیتی تھی کہ یہ کون صاحب ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں۔ بھلا جب تک آدمی کا اَتا پتا ہی نہ معلوم ہو انسان بات کیا خاک کرے۔ تنگ آ کر میں نے ایک بھرپور وار کیا۔

"آپ آجکل بھی اُسی جگہ ہوتے ہیں جہاں پہلے ہوا کرتے تھے؟"

"مگر اللہ ری بے نیازی وہ اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئے اتنی

بے بسی کا عالم تھا کہ مجھے خود پہ ترس آنے لگا - یا تو لوگ جلدی جلدی ملتے رہیں کہ دوسروں کی یادداشت امتحان میں تو نہ پڑے یا بھئی ہر بار تعارف کرا دیا کریں -

مگر وہ مردِ مجاہد میری یادداشت کو امتحان میں ڈالنے پر تلا ہوا تھا اور ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا -

اب جو سٹپٹا کر ذہن پہ زور ڈالا تو ایک دم میری آنکھوں سے سارے پردے اُٹھ گئے - ایک ریلوے ٹھیکیدار کی شبیہہ ذہن میں اُبھری - اوہو! یہ تو وہی شخص ہے ہمیشہ سے ہی جیرے میاں کی دوستی کا دم بھرتا ہے اور ہے بھی خاصا مخلص - ہاں واقعی - ریلوے اسٹیشن پر ایک بک سٹال بھی تو ہے اس کا! -

"سنا بیٹے! آپ کا ریلوے بک سٹال تو خوب چل رہا ہے" - میں نے ایسے کہا جیسے چور پکڑ لیا ہو

"ریلوے بک سٹال کس کا ؟" وہ خاصا فکرمند ہو گیا -

"آپ کا ؟" میں نے بڑے اعتماد سے کہا -

"لاحول ولا قوۃ ارے صاحب میں تو وکالت کرتا ہوں -"

"وکالت" ؟ میں اب چکرائی -

"جی ہاں میں تو عرصہ سے وکالت کے پیشہ میں ہوں "

"تو شاید بہلے"۔ میں نے سوچا شاید مان جائے۔

"ارے نہیں صاحب۔ وہ کچھ جھنجلائے۔ یوں کہیئے ناکہ آپ نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔"

"نہیں جناب یہ بات نہیں —— وہ شاید.... میرا مطلب ہے ...... توبہ...... دھوپ کتنی تیز ہو رہی ہے"۔ مارے خفت کے کچھ بن نہ آیا۔ بچاؤ کے لئے لپک کر ہیں ایک درخت کے نیچے ہو گئی "بس کا طویل سایہ اس وقت بالکل ناکافی معلوم ہو رہا تھا۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہن پہ زور ڈالنے سے یہ تو منکشف ہو جاتا ہے کہ شکل نہ صرف دیکھی ہوئی ہے بلکہ جان پہچان بھی پرانی ہے مگر نام یاد نہیں آتا۔

مزید ذہن کو ٹٹولا تو تین چار نام گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔ نجمہ ہے کہ جانے سعیدہ۔ شاید مریم۔ مگر مریم کا چہرہ تو بھیڑی ہے۔

کچھ کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ ارے بھئی یہ تو وہی ہے.... وہ اس کا گھر بھی یہیں قریب ہی تو ہے۔ نام بھی بھلا سا ہے۔ خیر ذرا دیر چپ رہو ابھی نام بھی یاد آئے جاتا ہے۔ مگر کہاں لیجئے اک ذرا نظر اٹھائی کہ ادھر سے سلام بھی ہو گیا۔ اب میں ہوں کہ جیسے تفکر کا عالم طاری ہو گیا۔ دوستی کا معاملہ ہے نام سے تو مخاطب کرنا ہی چاہیئے پر نام

آج یاد آتا ہے نہ کل۔ اب میں دل ہی دل میں اپنی اس یادداشت پر جلیش کھا رہی ہوں اور کچھ بن نہیں آتا۔

"ارے میں مسرت ہوں"۔ آخر وہ تاڑ ہی گئی۔ "پہچانا نہیں مجھے"۔

"واقعی"؟ میں نے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا۔

"بھئی خوب ہو تم بھی" وہ اصلیت کو بھانپ چکی تھی۔

سرکاری دفتروں سے متعلق لوگوں کی نہ تو مجھے شکلیں یاد رہتی ہیں نہ نام۔ شاید اس لئے بھی کہ کبھی کبھار جب کوئی بل ادھر اُدھر ہو جائے، یا کوئی ایسی ہی ضرورت آن پڑے تب ہی اُدھر جانے کا اتفاق ہوتا ہے لہٰذا اس قسم کے جملہ افراد کو میں نے ان کی کرسیوں یا خاص عادتوں سے پہچاننے کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔

مثلاً فلاں دفتر کے فلاں سیکشن کی تیسری لائن کی چوتھی کرسی پر متعلقہ شخص موجود ہوتا ہے۔ یا فنانس ڈیپارٹمنٹ میں جو ایک صاحب ہیں وہ پان بہت کھاتے ہیں اس طرح مجھے ان کے سیکشن اور نام جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مگر ایک بار ان سے کوئی کام آپڑا تو میری ـــــ ساری پیش بندیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔

"سنیے! وہ صاحب جو پان بہت کھاتے ہیں کس سیکشن میں ملیں گے"؟

میں نے ان کا اُدھر چھوڑ بتائے بغیر ایک صاحب سے پوچھا۔ "ارے بھئی ...... وہ ...... وہ اصغر صاحب" مخاطب کو متفکر دیکھ کر مجھے ایک نام گڑھنا پڑا۔

"اصغر۔ اصغر۔ اصغر" مخاطب کا ذہن چک پھیریاں کھانے لگا۔ "اچھا وہ جو ذرا لمبے اور بھاری سے ہیں"۔ آخر بیچارے نے خود ہی بوجھ لیا۔

"جی ہاں۔ وہی بالکل وہی"۔

تو مبشر کہیئے نا ان کا نام مبشر ہے۔

ادھر جن لوگوں کو میں نے ان کی کرسیوں سے پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بھی گھپلا ہی رہا۔ اکثر یوں ہوا کہ کرسی تو موجود ہے مگر متعلقہ شخص کی جگہ اس کرسی پہ کوئی اور صاحب براجمان ہیں۔ بے خبری میں جب میں کسی بل کے چکر میں مشکل کشائی کے لیے وہاں پہنچتی ہوں تو اور ہی گل کھلتا ہے۔

"یہ بل؟" میں نے بڑے اعتماد سے ایک صاحب کو جا پکڑا۔ "یہ یہاں پہنچا کہ نہیں"۔

"جی نہیں"۔

"کیوں نہیں پچھلی بار تو اس کرسی ...... اچھا ٹھہریئے۔"

"ایک دو۔ تین چار۔ پانچ"۔ شک دُور کرنے کے لئے میں نے

کرسیوں کو ایک قطار میں گِنا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ ۔ ۔ ۔ یہی کرسی ہے۔ بالکل یہی۔"

"کیا مطلب؟ وہ چونکا"

"بھئی مطلب تو بِل سے ہے۔"

"مگر آپ تو کرسی کی بات کر رہی تھیں"

"اِسی لئے تو آپ سے پوچھ رہی ہوں"

"گویا آپ کے خیال میں میں کرسی ہوں؟"

"ارے نہیں"۔ میں اب سٹ پٹائی۔

"مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا" وہ بھی اَڑ گیا۔

"ارے بھئی وہ تو کرسی کا نمبر گنا تھا میں نے، شکل جو یاد نہیں

رہتی" بات بگڑتے دیکھ کر میں گھبرائی۔

"اچھا جب ہی" وہ ہنس پڑا۔

"کیا! کیا" میں گھبرائی کہ خدا جانے کیا مطلب ہے اس کا۔

میں نے کہا جب ہی آپ بِل کے لئے میرے سر ہو رہی تھیں۔

"دیکھئے نا!" اُس کا دماغ راستی پہ آچکا تھا۔

"بلوں کا کام تو اب حامد صاحب کرتے ہیں اور وہ اب ادھر

بیٹھتے ہیں... وہ ۔وہ —وہ —" اس نے دُور کونے میں ایک شکل کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا وہ... وہ جو خاکی قمیص پہنے ہوئے ہیں۔

بھول جانے کے ڈر سے میں نے اس کی شناخت قائم کی اور جان چھڑا کر ادھر کو لپکی۔

# فرصتِ زندگی سے مت پوچھو

گھنٹی کی آواز سنتے ہی میں تو سُن سے رہ گئی کہ لو بھئی ہو گیا
حملہ اور یہاں ابھی ہفت روزہ غسل شریف کا اہتمام ہی ہو رہا
ہے۔ ہاتھ میں تولیہ پکڑے پکڑے میں نے کواڑ کی درز میں سے جو
جھانکا تو حملہ آور خواتین میں سے کچھ برآمدے کی طرف بڑھتی
نظر آئیں۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی سامنے ہی نہ تھا آواز دینے میں
صریحاً خطرہ تھا۔ اب بیشتر اس کے کہ غنیم سے دوبدو مقابلہ ہو،
میں نے اسی میں عافیت دیکھی کہ جھٹ سے غسل خانہ میں گھس چٹخنی
بند کر لی جائے۔ اس قدر محفوظ مقام پر پہنچ کر میں ابھی اپنی
دانشمندی پر پوری طرح مسرور بھی نہ ہو پائی تھی کہ دروازے پر

کھٹ کھٹ کے ساتھ صاحبزادی کی حواس باختہ آواز سنائی دی۔

"انہیں بٹھاؤں کس کمرے میں؟"

"اوہو... ہ ہ ہ غسل خانے کے سوا ہر جگہ۔"

دراصل مجھے راہ فرار اختیار کرتے دیکھ کر وہ گھبرا اُٹھی کہ خدا جانے حملہ آور کس قسم کے برتاؤ کے مستحق ہیں۔ بہرحال جیسے تیسے غسل کا مرحلہ طے ہوا، سر پر تولیہ کا پگڑ لپیٹ، میں تیر کی طرح جھپٹ کر پہنچی ان کے استقبال کو۔

"ارے! ارے! کب تشریف لائیں آپ۔" میں بڑی حکمت سے انجان بن گئی۔

"بس ابھی! شاید آپ نہانے گئی ہیں اور ہم آئے ہیں۔" انہوں نے ایسے اعتماد سے کہا جیسے عین موقع پر مجھے غسل خانہ کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا ہو

"اچھا! اچھا۔" معاملہ کی نزاکت کے پیش نظر میرا منہ اُتر گیا۔

"پر سردیوں میں اتنے ناوقت نہانا......"

"ہاں کیا کیا جائے چھٹی جو ہوئی۔"

"اچھا ذرا فرصت سے۔"

"توبہ کیجئے فرصت! یہ دیکھئے" میں نے انہیں الگنی پر پھیلے ہوئے

کپڑوں کی طرف متوجہ کیا۔

"ارے ہاں، کپڑے تو بڑے صاف دُھلے ہیں"۔ وہ بات کو کہیں سے کہیں لے گئیں اور میں ڈری کہ کہیں وہ آئندہ اپنے میلے کپڑوں کا گٹھر ادھر ہی روانہ کرنے کا حکم صادر نہ فرما دیں۔

آخر وہ مجھ سے اگلے اتوار کو اپنے گھر آنے کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئیں۔ کرنے کو تو میں نے ان سے وعدہ کر لیا۔ مگر مجھے خوب پتہ تھا کہ اگلا اتوار تو ضرور آئے گا۔ مگر ان کے دولت کدہ پر قدم رنجہ فرمانے کی سعادت کم از کم میرے نصیب میں نہ آسکے گی اور سچ پوچھئے تو میں نے اس کی ضرورت بھی کم ہی محسوس کی ہے۔ مدتوں سے بسوں میں روزانہ آنے جانے سے ایک ہی تو دل پسند سہولت ملی ہے کہ اس آمد و رفت کی بدولت نہ صرف پُرانے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے بلکہ نئے چہروں سے بھی شناسائی ہوتی رہتی ہے۔

صبح ہو یا شام جب ساری وحشت کی ماری صورتیں ایک ہی منزل کو رواں دواں ہوتی ہیں تو اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہم ہزاروں مسائل میں اُلجھے ہوئے دماغوں سے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں۔ اور کھسیانی ہنسی ہنس ہنس کر

آپس میں خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے۔ یوں ان بسوں کے طفیل اپنی ملاقاتوں کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ کیونکہ چھٹی کے دن تو گھریلو مصروفیت کا ایسا طوفان پھٹ پڑتا ہے کہ کسی سے ملاقات کا تصور تو در کنار میں تو اپنے کو بھی بھول بیٹھتی ہوں کہ میں ہوں کہاں!

پر آج کی چھٹی کے دن تو میں نے طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے آج تو سارا دن مکمل آرام کیا جائے تاکہ جی بھر کر سونے اور پڑھنے کا شوق بھی پورا ہو سکے۔ کتاب ہاتھ میں لیتے وقت سوچا کہ جب تک نیند نہ آئے کتاب سے ہی شغل رہے۔ مگر ہونہار بات ہو کر رہی۔ کتاب سے پہلے نظر کھڑکی سے باہر آلوچہ کی پھولوں سے لدی ڈالیوں پر جا پڑی۔ یک بارگی طبیعت ترنگ میں آگئی۔ جی چاہا کہ ذرا کمرے سے باہر نکل کر اس پیڑ کے سراپا پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ کم بخت پھولوں کا گھنا بنا کھڑا تھا۔

اب جو میں نے قدم باہر نکالا تو آلوچہ کے پھولوں سے پہلے میری نظر کوارٹر میں بسنے والی مخلوق کی اولاد ناہنجار پر جا پڑی۔ جس نے چہار اطراف میں وہ دھما چوکڑی مچا رکھی تھی کہ خدا کی پناہ۔ اور اسی پر بس نہ تھا ان کے اصل کرتوت تو اس گندگی، کوڑا کرکٹ اور پتوں کے ڈھیر سے اجاگر ہو رہے تھے جو گھر کے چاروں طرف بصد اہتمام سجائے گئے تھے۔ اور اس قوم ناہنجار کے بجا رنماد الدین

اپنی اولاد کے ان گنوں سے بے خبر یوں خوش گپیّوں میں مصروف تھے جیسے انہیں کوڑا کرکٹ پھیلانے کے کام پر ہی متعین کیا گیا ہو اور وہ اس فرض سے نچنت ہو کر اطمینان کا سانس لے رہے ہوں۔

مجھے دیکھتے ہی چھوٹی مخلوق تو باہر کو کھسک گئی اور بڑے راہِ فرار نہ پاکر بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

"خدا تمہیں سمجھ دے، دیکھو تو کتنا کوڑا کرکٹ پھیلا رکھا ہے"۔

"اجی کیا کریں بچے جو ہوئے"۔ بچوں کا لفظ اس تیقّن سے ادا کیا گیا کہ دنیا تو درکنار بچوں کے بہانے وہ عقبیٰ کے عذاب سے بھی چھوٹ جائیں گے۔

"اچھا بچے! اور ہیں کہاں بچّے"؟ مجھے یاد آیا کہ سارے شیطان مجھے دیکھتے ہی کس پھرتی سے فرار ہوئے تھے کہ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اب کہنا بھی کیا تھا اور اس سے سوائے اس کے کیا حاصل تھا کہ اپنا ہی کلیجہ جلاؤ اور چپ رہو۔

اسی خیال سے میں بڑی بہادری سے پسپا ہو رہی تھی کہ اک دم باڑھ پر نظر پڑی جس کے ایک حصّہ کا بالکل کچومر نکل چکا تھا۔ پوچھ گچھ کرنے سے پتہ چلا کہ یہ پڑوسیوں کے بچوں کا کارنامہ ہے۔

"اوہ.... ہوں تو یہ بات اس کم بخت مالی نے مجھے اب تک

کیوں نہ بتائی۔ ایک تو خود ہی کیا کم ہے کہ اوپر سے پڑوسیوں کے بچوں کو بھی تباہی پھیلانے کو مدعو کرتا ہے"۔ اب جو مالی کی دہائی دی تو وہ ندارد۔ کتنی بار مردود سے کہا ہے کہ چھٹی کے دن تو اپنی شکل دکھا جایا کرو مگر ہمیشہ مجھے ترڑی دے جاتا ہے۔

عین اس وقت جبکہ مالی اور پڑوسیوں کے بچوں کی دی ہوئی مشترکہ عقوبتوں سے میرا پارہ چڑھ چکا تھا، زینب بیگم چہرہ پر حماقت آمیز مسکراہٹ لئے ایک کونہ سے طلوع ہو کر میرے سر پر آموجود ہوئیں۔ یہ وہ ذات شریف ہیں جو پورے ہفتہ مجھے بے نمک مرچ اور کبھی تیز مرچوں والا بدمزہ کھانا پکا کر کھلایا کرتی ہیں۔ ان کے پاس بدمزہ کھانا پکانے کے ایسے ایسے تیر بہدف نسخے ہیں کہ کبھی وہ اس فن میں ناکام نہیں رہیں۔ ہمیشہ تیر نشانے پر بیٹھتا ہے اور آن کی آن میں کھانا یوں بدمزہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ حلق سے اتارے نہیں اترتا۔ وہ کھانوں کے مسالوں میں تخصیص روا رکھنے کی قائل نہیں اس لئے دنیا بھر کے کھانے وہ اپنی اکلوتی نادر ترکیب سے پکا ڈالتی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ مجھے کھانے کے مزہ کے معاملہ میں انتہائی احمق بھی تصور کرتی ہیں لہٰذا میری بات کو قطعاً درخور اعتنا نہیں گردانتیں۔ نتیجہ میں جب کبھی بھی میں نے مرچ یا نمک کی تیزی کی شکایت کی۔ یہی جواب ملا کہ تمہارے منہ کا مزہ

ہی خراب ہے" ورنہ سالن میں نمک مرچ کی مقدار لنگے حسابوں ٹھیک ہے اور جو کہو کہ کھانا اتنا بدمزہ کیوں ہے تو جواب یہ موجود ہے کہ کبھی تو بغیر ناک بھوں چڑھائے بھی کھانا کھا لیا کرو۔"

چنانچہ ان کی شکل شریف دیکھتے ہی بے مزہ کھانوں کی یاد سے میری طبیعت متوحش ہونے لگی۔ اور میں نے وہیں کھڑے کھڑے انہیں یہ فیصلہ سنایا کہ آج وہ مطبخ میں نہ تو قدم دھر سکیں گی اور نہ کھانا پکانے کی وہ عجوبۂ روزگار تراکیب آزما سکیں گی۔

تو رُوٹھی، میں چھوٹی، کے مصداق وہ تو آزاد ہو کر دور جا بیٹھی مگر اپنے کو کام دہن کی یہ تواضع بڑی مہنگی پڑی۔ دراصل گھرداری وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس میں ایک بار غوطہ زن ہو جائیے تو وہ وہ اسرار و رموز آشکار ہوتے ہیں کہ دماغ چکرا کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت جب یہ رموز مجھ پر منکشف ہوئے تو پتہ چلا کہ منجملہ اور کاموں کے صفائی کے سلسلہ میں گھر پر دستِ شفقت بھی دراز کرنا ہے۔ ناچار میں دونوں کاموں کی طرف ملتفت ہو گئی اور یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں۔ ہم عورتوں کو بیک وقت دو کام کرنے میں مہارت تو ہوتی ہی ہے اس لئے میں نے ایک ہاتھ میں جھاڑن اور دوسرے میں ہانڈی کا چمچہ پکڑ کر بزن بول دیا۔ اب ہانڈی بھی بھونی جا رہی ہے

اور باورچی خانہ کی صفائی بھی جاری ہے - بس ذرا دھیان ہانڈی کی طرف رکھنا پڑتا ہے کہ ذرا چوکے اور گئی ہانڈی ہاتھ سے جب دوسرے کمروں کی صفائی کا نمبر آیا تو نقشہ یوں رہا کہ ایک ٹانگ باورچی خانہ میں اور ایک ادھر سرے والے کمرے میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر چکر لگاتے لگاتے دماغ چکر کھا جاتا ہے اور دوڑتے دوڑتے ٹانگیں جواب دینے لگتی ہیں مگر میں دونوں کام نمٹا کر ہی دم لیتی ہوں - بلا سے ٹانگیں جائیں یا رہیں - پر عورت ذات ہوں ، کوئی بدسلیقہ اور بے ڈھنگا تو نہ کہہ سکے گا

ذرا سی دیر میں ہی دن ڈھلنے لگتا ہے تو یاد آتا ہے کہ اس ہفتہ اپنے سلائی پرائی کے جوہر تو کھلے ہی نہیں اور کچھ نہیں تو . . . مرمت طلب کپڑوں پر ہی نظر کرم ہو جائے - ارے ہاں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر تو دنیا میں کوئی کام ہونے سے رہا - اور پھر کم آمدنی میں سارا ہنر ہی ان دو ہاتھوں کا ہے لہذا دکھتی کمر اور لرزتے ہاتھوں سے میں میدان خطاطی میں بھی اپنے جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتی -

جب سارا دن کی مہم جوئی کے بعد ، میدانِ کارزار پر سناٹا چھا جاتا ہے - تب میں سپہ سالارِ اعظم کی طرح دن بھر کی کارگزاریوں کا جائزہ لیتی ہوں اور مقتولین اور مجروحین کی تعداد کا پتہ چلانے کے لئے یہ دیکھتی

ہوں کہ اپنے ہاتھ کس کس جگہ سے جل گئے یا چھل گئے ہیں اور انگلی پر یہ کاری ضرب کہاں کی ہے، ہتھیلی کے کنارے پر یہ نشتر کس وقت لگا اور یہ انگوٹھا کس وجہ سے بے حد دکھ رہا ہے اگر یہ کچلا گیا ہے تو کس آلۂ بیلنج سے اور یہ ٹانگیں جو دکھنے کے ساتھ ساتھ اکڑی ہوئی بھی ہیں ان پر یہ کیفیت سارا دن کھڑے رہنے سے طاری ہوئی ہے یا یہ حالت کسی دیوار پا کھبے یا کواڑ سے ٹکرانے کا نتیجہ ہے۔ اس تحقیق کے بعد، آیوڈیکس، وکس، ٹنچر اور مرہم سے جسم پر انتقامی کارروائی شروع ہو جاتی ہے اس کارروائی کے دوران ذہن کے دریچے کھلنے لگتے ہیں اور یکدم یاد آتا ہے کہ یہ دن جو اس قدر مہمات امور خانہ داری سر کرتے ہوئے گزرا ہے اس کے بارے میں میرے اصل منصوبے کیا تھے....

یعنی سوچا یہ تھا کہ جی بھر کر آرام کرنے کے بعد وہ کتاب جو بڑے شوق سے لائبریری سے لائی گئی تھی اسے آج پڑھ ڈالا جائے کیونکہ ان لوگوں نے جنہیں قدرت نے لکھنے پڑھنے کے سوا اور کسی کام کے لئے پیدا ہی نہیں کیا، طعنے دے دے کر میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ کہ میں کتاب پڑھنے کی اہل نہیں ہوں۔

اور جو سچ پوچھئے تو ایک نیک خیال یہ بھی تھا کہ مضمون کا وہ مواد جو ہفتے بھر سے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا اسے کاغذ پر

منتقل کر دیا جائے لہذا گھبراہٹ اور جھنجھلاہٹ میں کبھی کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کئے جاتے ہیں تو کبھی کاغذوں کا تھقبا سامنے رکھ کر طبیعت کو مضمون نویسی کی طرف مائل کیا جاتا ہے ۔ ادھر نیند اپنی گرفت میں لینے کی منتظر ہوتی ہے ۔ آخر سارا دن کی بھاگ دوڑ اور بک بک جھک جھک سے تھکا ہارا جسم نیند کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے ۔

# پڑوسن

جب پُرانی پڑوسن میرے بارے میں تمام جاسوسی صرف فرما کر اپنی معلومات مکمل کر چکیں تو اس خیال سے دل کو تسلّی دی کہ چلو چند دن کی بات ہی تو اور ہے اس کے بعد تو یہ تشریف لے جانے والی ہی ہیں اور نئی پڑوسن جیسی کچھ بھی ہو گی اس قدر جاسوس قسم کی تو نہ ہو گی، سوچا کہ میں خود بھی اب کی بار اتنی احمق بن کر نہ رہوں گی کہ جو چاہے میری نقل و حرکت کا پتہ کر لے اب سے میں بھی لوگوں کی نگاہوں پر کڑی نظر نہ رکھوں تو سہی۔

کچھ یہ بات نہیں کہ مجھے اپنی ناشائستہ حرکات کی تشہیر کا خطرہ تھا یا اپنی بے اعتدال زندگی کی بدولت بدنامی کا دھڑکا لگا ہوا تھا پر خدا جانے کیا بات تھی کہ ان کے دم قدم کی بدولت ہمیشہ اپنی حالت

نظر بندوں کی سی معلوم ہوتی۔ اور یوں محسوس ہوتا کہ ان کا دولت خانہ محکمہ سراغرسانی کا دفتر ہے جہاں اپنی ہر حرکت کی خبر بلا چوں و چرا پہنچ جائے گی ــــــ ہمارے گھر کون آیا؟۔ کون گیا ہے!۔ اس قسم کی باتیں تو گویا ان کے ناخنوں میں پڑی ہوئیں تھیں کیونکہ دِن بھر پڑے پڑے اپنے کمرے کی جالیوں میں سے چہار جانب کی صورتِ حال کا جائزہ لینا تو وہ اپنے فرائضِ منصبی میں سے تصور کرتی تھیں طرفہ ستم تو یہ تھا کہ رات کے وقت بھی وہ دن ہی کی طرح "چوکنّا" رہتیں۔ بارہا یہ کوشش کی کہ دن میں نہ سہی تو رات کے وقت ہی میں اور میرے ملاقاتی ان کی نظروں سے بچنے میں کامیاب ہو جائیں مگر توبہ کیجئے! ان کو جُل دینا آسان کام تھا کوئی! وہ جو رات کو آپ کے محافظ کتّے سے بھی زیادہ ہوشیار چوکیدار ہو اس سے بھلا آپ کہاں بچ کر جا سکتے ہیں۔

گرمیوں بھر وہ اپنے سہ منزلے کی چھت پر یا تو ساری رات ٹہلا کرتیں یا بستر پر لیٹی فضا کو سونگھتی رہتیں۔ اور صبح اٹھ کر رات بھر کی چوکیداری کی ــــــ داد لینے آموجود ہوتیں۔

"رات آپ کا کتّا کتنے زور سے بھونک رہا تھا" وہ تمہید باندھتیں۔

"بھونکتا ہوگا کم بخت"۔ بے نیازی سے جواب دیا جاتا۔

"حد ہے کہ اتنے شور سے بھی آپ کی آنکھ نہیں کھُلتی۔ سب بے خبر

پڑے سوتے رہتے ہیں" ـــــ وہ اپنی معلومات کے دریا بہاتے بہاتے تہدید پر اُتر آتیں ـــــ اور یہاں کوئی اثر نہ ہوتا۔

پھر اسی پر بس نہیں ایک روز صبح ہی صبح نازل ہوئیں اور آتے ہی حکم دیا "نکالو اس کم بخت کتّے کو گھر سے"۔

"کوئی وجہ ـــــ؟"

"رات کو چور"۔ انھوں نے معنی خیز انداز سے آنکھوں کو حرکت دی۔

"کہاں! آپ کے گھر؟" میں نے سوچا کیسا اچھا ہوتا اگر مال و اسباب کی جگہ چور ایسی "جاسوس" قسم کی پڑوسنوں کو ہی لے جایا کرتے کم از کم اپنی جان تو چھُٹ جاتی۔

"نہیں آپ کے یہاں!"۔ انھوں نے معاملہ کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے بھرپور وار کیا۔

اپنے غریب خانہ پر چور کی آمد کی اطلاع سے حیرانی ضرور ہوئی مگر ان کا دل رکھنے کے لئے ماننا پڑا۔

"لیکن.... لیکن آپ کو کیسے خبر ہوئی؟"

انھیں معلومات کے اظہار کا موقع اللہ دے۔ چہک کر بولیں۔

"میں نے سڑک پر جھانکا تو چور پیڑ کی اوٹ میں کھڑا تھا اور یہ نامراد آپ کا کتّا پڑا سو رہا تھا۔"

دل میں آیا کہہ دوں کہ واقعی تمہارے ہوتے ہوئے مجھے ہی کیا محلّے بھر کو نہ کسی چوکیدار کی ضرورت ہے نہ کسی رکھوالے کتّے کی، اور وہ جو کھوجی کتّے مشہور ہیں وہ تو مفت میں بدنام ہیں وہ بیچارے کیا مقابلہ کریں گے تمہارا۔ پر مصلحت آڑے آئی۔

پیٹ کی ہلکی تھیں اس لئے کسی بات کو اپنے تک محدود رکھنا تو جانتی ہی نہ تھیں دوسروں کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کو تو شروع سے ہی بُرا نہ سمجھتی تھیں اس لئے اس کی تصدیق بھی کر لیا کرتی تھیں مگر اس یقین اور وثوق کے ساتھ کہ جھٹلانے کی کوئی گنجائش نہ چھوڑتیں بلبشتر ان کی گفتگو کا انداز کچھ اس قسم کا ہوتا تھا:

"کل شام کو آپ جس عینک والے لڑکے کے ساتھ جا رہی تھیں وہ آپ کا بھائی تھا؟ شکل آپ سے ملتی تھی؟"

"وہ لمبے بالوں اور چھوٹے قد والی لڑکی کون تھی؟ میں نے آپ کے دروازے پر دیکھا تھا اسے۔"

"میں باہر ہی کھڑی تھی جب رات کو آپ کی بہن آئی تھی!۔ چلی گئی کیا؟"

"آپ کل بڑی رات کو گھر آئی تھیں میں نے کمرے کی جالیوں میں سے دیکھا تھا۔"

وہ میری ہر حرکت کی کیونکہ چشم دید شاہد تھیں اس لئے انکار کی کسے مجال تھی! ایک مجرمانہ احساس کے ساتھ اقبال جرم کرنا پڑتا اور عینک والے بھائی۔ چھوٹے قد والی لڑکی اور خود دیر سے گھر آنے کے بارے میں تمام باتیں مسکین شکل بناکر سچ سچ بتانی پڑتیں۔

ان کی اس قسم کی باتوں سے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میری زندگی ایک ایسی کھلی کتاب ہے جسے دوسرے نہ سہی تو کم از کم وہ تو ہر وقت پڑھ ہی سکتیں ہیں کہ ایک دن قدرت نے میری بے بسی پر ترس کھایا اور اس کتاب کا ایک ورق اس قدر خاموشی سے اُلٹ دیا کہ مجھے پہلی بار اپنی زندگی کے اپنے ہونے کا گمان ہونے لگا۔

گھر کے سب لوگ رات کو ایک بجے سیکنڈ شو دیکھ کر واپس ہوئے۔ پر انھیں کانوں کان خبر نہ ہوئی..... ایک دن۔ دو دن۔ چار دن گذر گئے۔ انھوں نے کچھ نہ پوچھا..... ان سے روز ملاقات ہوتی اور کان اس ذکر کے منتظر ہی رہ جاتے۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ کچھ تو اس خیال سے کہ میرے بارے میں ان کا ریکارڈ نامکمّل نہ رہے اور کچھ یہ جتانے کے لئے کہ اگر میں نہ چاہوں تو وہ میری نقل وحرکت کا پتہ نہیں لگا سکتیں ہیں۔ ایک روز میں نے بڑے فاتحانہ انداز میں انھیں اس رات کو دیر سے گھر آنے کے معرکہ کا حال سُنایا۔

"ہاں ہاں" ــــــ انھوں نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا "مجھے معلوم تھا پر میں پوچھنا بھول گئی تھی۔"

"تو یہ بھی ..... یعنی کہ آپ اس وقت بھی..."

مارے حیرانی کے الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

وہ جب تشریف لاتیں تو مجھے ان سے بات کرنے کے لئے موضوع نہ سوجھتا، اس لئے کہ محلہ کی "سنسنی خیز خبروں"۔ لوگوں کے گھر مہمانوں کی آمد و رفت"۔ ملازموں کی "اکھاڑ پچھاڑ" قسم کے معاملات میں اپنی معلومات ہمیشہ سے ناقص رہی ہیں۔ مگر وہ انھیں فرسودہ موضوعات میں ایسی جدّت پسندی سے کام لیتیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا اور لطف یہ کہ مخاطب کو بولنے کی نوبت ہی نہ آتی پر اس کی معلومات میں بتدریج اضافہ ہوتا رہتا۔ ان کے پیٹ میں معلومات کا بحرِ ذخّار موجزن تھا جسے اُگل کر ہی انھیں چین آتا۔ محلہ بھر کے نوکر ان کے نزدیک "راویٔ معتبر" تھے۔ جن کے درمیان وہ "بردھان منتری" بنی بیٹھی ان کی باتوں پر "آمنّا و صدقنا" کہا کرتیں اور حسب ضرورت بُرے آقاؤں کو قابو میں کرنے کے نسخے اور اچھی جگہ ملازمت حاصل کرنے کے گرُ بھی بتاتی رہتیں ــــــ ایسی پُراز معلومات پڑوسن کی موجودگی میں مجھے اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا شدّت سے احساس

ہوتا۔ مگر وہ تو طوفانی ریلے کی طرح مجھے زندگی کے نشیب و فراز سے باخبر کرنے آتی تھیں۔ اس لئے آتے ہی شروع ہو جاتیں۔

"جلدی آیئے! جلدی"۔ ایک روز دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتی ہوئی اپنے کمرے سے بھاگی چلی آئیں۔

اس بے تابانہ انداز پر کون کافر ہوگا جو دوڑ نہ پڑے چنانچہ باہر آکر کسی پٹاخہ دار خبر کے کان منتظر ہی تھے کہ وہ رازداری کے انداز میں قریب کھسک آئیں اور دُور ایک گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں: "اُدھر سے رونے کی آواز آرہی ہے نا!"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"نہیں پہلے سنو تو!" انھوں نے اصرار کیا۔

آخر کان کھڑے کئے۔ دن کے ہنگامہ میں ہر آواز ہی ہاؤ ہُو کی صدا بن جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مگر کہا —— "ہاں کچھ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔

"قتل ہوگیا ہے ان کے گھر"۔ آخر وہ پٹاخہ چھوڑ کر رہیں۔

دل گھبرا اٹھا۔ یہ پوچھنے کی ہمّت نہ ہوئی کہ کس نے کس کو مارا۔ ایک بے جان جسم اور خون سے لتھڑے کمرے کے تصوّر سے لرزہ طاری ہونے لگا۔ سَر چکراتا ہوا معلوم ہوا۔ آخر بمشکل ان سے جان چھڑا کر

بستر پہ آ گر دم لیا۔

دو چار روز کے بعد انھوں نے۔بڑی رونی صورت بنا کر بتایا کہ اس گھر میں قتل وتل کچھ نہ ہوا تھا بلکہ اصل واقعہ یوں تھا کہ گھر اکیلا تھا اس لئے چھوٹے بچے رو رہے تھے۔

ایک اور بار طلبی ہوئی، جانا پڑا۔ پوچھا کیا بات ہے ؟ "بات تو کچھ نہیں ایسے ہی دل گھبرا رہا تھا!" پھر حسب دستور رازداری پر اُتر آئیں —— "یہ جو سامنے نیا گھر بن رہا ہے نا!۔ اس کے مالک یہی نوجوان لڑکا اور لڑکی ہیں۔ جو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے نظر آتے ہیں" —— آخر رہ نہ سکیں بولیں "ان کی شادی ہونے والی ہے۔ اور یہ کوٹھی لڑکی کو جہیز میں ملے گی۔"

"ہوگا"۔ اپنا انداز بدستور بے نیازانہ تھا۔

یوں انھیں مزید گل افشانی کی ہمّت نہ پڑی اور سہم کر چُپ سی ہوگئیں بعد کے واقعات سے ان کا اندازہ نہایت غلط ثابت ہوا اس لئے کہ وہ دونوں حقیقی بہن بھائی تھے۔ البتہ یہ کہ کوٹھی لڑکے کی ملکیت رہے گی یا لڑکی کو جہیز میں ملے گی۔ اس کا فیصلہ بیچاری پڑوسن اپنی قبل از وقت روانگی کی وجہ سے نہ کر سکیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد ہفتوں ان کی معلومات افزا باتیں یاد

آ آ کر دل دکھاتی رہیں۔ مگر جلد ہی ان کا بدل مل گیا۔ محلہ کی رونق میں اضافہ ہونے سے کسے خوشی نہیں ہوتی۔ میں بھی دور ہی سے محلہ کی چہل پہل سے لطف اندوز ہوا کرتی اور آتے جاتے یوں نظر چرا کر دیکھتی کہ بھرپور نظر ڈالی تو کہیں پیچ مچ نظر ہی نہ لگ جائے۔ مگر نئی پڑوسن کون ہیں؟ کیسی ہیں؟ اس کی طرف میں نے کبھی توجہ نہ دی۔ میرے لئے تو یہی خوشی کافی تھی کہ پڑوس آباد ہو گیا ہے۔ البتہ شام کو واپسی پر ان کے بارے میں اس خیال سے ایک آدھ سوال ضرور کر لیتی کہ گھر والوں کی معلومات میں میں بھی برابر کی شریک رہوں۔

ایک روز گھر پہنچی تو سارے کمرے بھائیں بھائیں کرتے معلوم ہوئے پتہ چلا کہ بستروں اور چارپائیوں سے لے کر ضرورت کی ہر چیز نئی پڑوسن کے گھر پہنچ چکی ہے۔ گویا مجھ پر "حق شفعہ" قائم ہو رہا تھا۔ مارے خوش فہمی کے میں نے سوچا بیچاری بے حد اپنائیت پسند ہیں۔ اسی لئے تو تکلف انھیں چھو کر نہیں گذرا۔ جب رفتہ رفتہ اپنے گھر کی بھنگن۔ نوکر اور دھوبن سے بھی ان کے تعلقات استوار ہو گئے تو اپنے کو ملامت کرنے کو دل چاہا! ۔ حد ہو گئی ہے ان کی اپنائیت اور میری غیریت کی۔ یعنی کہ وہ اتنے قریب آ چکی ہیں اور میں ہوں کہ بدستور انجان بنی دور کھڑی ہوں۔

اب مزید دیر کی گنجائش نہ تھی اس خیال سے کہ کہیں واقعی وہ مجھے بد اخلاق نہ سمجھ بیٹھیں میں نے ملاقات کا ارادہ کر ڈالا۔

وہ برآمدے میں بیٹھی تھیں، مجھے دیکھ کر پہلے کچھ سٹ پٹائیں پھر ہڑبڑا کر اٹھ کر کھڑی ہوئیں اور مذبوحہ بکری کی سی نظروں سے کچھ یوں میرا جائزہ لیا کہ دل نے کہا۔ مار لیا پالا نئی پڑوسن مسکین صورت ہی نہیں بلکہ مسکین سیرت بھی ہیں۔

"ہر روز ارادہ کرتی تھی۔ مگر فرصت......"

"ہاں۔ آں کہاں فرصت ملتی ہے دفتر والوں کو"... انھوں نے میرے منہ سے بات اُچک کر لقمہ دیا۔

میرے کان کھڑے ہوئے پھر سوچا اس قدر بھی کیا بدگمانی آخر آتے جاتے تو انسان نظر آ ہی جاتا ہے۔ اور میں کوئی چوروں کی طرح چُھپ کر تو گھر سے نکلتی نہ تھی۔

مگر وہ تو جیسے پے بہ پے وار کرنے پر تُلی بیٹھی تھیں۔

"آپ کی بہن پشاور سے آ گئی کیا۔ ہاں آں آنے والی تھی نا!"۔ اُن کے اعتماد سے دل لرز اٹھا۔

"بہن تو نہیں البتہ بھائی کراچی سے"... بات پوری کرنے سے پہلے مجھ پر غنودگی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"تو وہ عینک والا لڑکا آپ کا بھائی ہے، کراچی سے آیا ہوگا۔"

گھرررر...... گھَن —— معلوم ہوا کسی نے گھڑی کی سوئیاں گھما کر پیچھے کر دیں ۔ نئی پڑوسن جاسوسی میں پرانی پڑوسن کی صحیح جانشین ثابت ہو چکی تھیں۔

# مفلسی کے دور میں

عام لوگوں کی طرح ہمارے والدین کو اتنی مقدرت تو کبھی ہوئی ہی نہیں کہ اپنا ذاتی گھر بھی بنا لیتے۔ چنانچہ خدا کے فضل سے ہم ساری عمر کرایہ دار ہی رہے۔ آئے دن مکانوں کی تبدیلی کا مسئلہ در پیش رہتا۔ ان مکانوں کی تبدیلی کے محرکات کیا ہوتے تھے۔ یہ تو اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا مگر جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ کچھ جان بچا کر بھاگنے کی سی کیفیت ہوتی تھی لیکن پرانے مکان سے چھٹکارا پانے سے زیادہ نئے مکان پر قبضہ کرنا بڑی "حکمت عملی" سے ہی ممکن تھا۔

دنیا جہان کے مالک مکان کیونکہ بڑے کنبہ والے کرایہ داروں سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے ہمارے دور اندیش والدین جب کسی مکان کی

تلاش میں نکلتے تو "بانگی" کے طور پر اپنے آٹھ عدد بچوں میں سے صرف دو کو ہی اپنے ساتھ لیتے۔ لیکن جب ہمارا قافلہ معہ اپنے "لاؤلشکر" کے نئے مکان پر حملہ آور ہوتا تو اپنے گھر کو آٹھ عدد "بے درماں بلاؤں" کی زد میں دیکھ کر مالک مکان سناٹے میں آجاتا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر وہ بے بسی کے انداز میں مسکرا کر کہتا۔ "ارے آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا تھا کہ آپ کے اتنے پیارے پیارے آٹھ بچے ہیں۔"

"خدا نظرِ بد سے بچائے۔" امی بڑی معصومیت سے ان کے زخموں پر نمک پاشی کرتیں "میں نے کبھی اپنے بچوں کو گنا نہیں۔"

ہم شہر کے جس علاقے میں رہتے تھے۔ وہ گندے ترین علاقوں کی "جملہ صفات سے متصف" تھا۔ بہترین قسم کے نم اور اندھیرے کمرے۔ گندگی اور کوڑا کرکٹ سے اٹی ہوئی نالیاں اور گلیاں، اس سب پر مستزاد ہر گھر کی بالائی منزل پر جھولتے ہوئے ہر عمر اور ہر سائز کے کپڑوں کے نظارے عام تھے مگر ہم اِرد گرد کی متعفن فضا سے بے نیاز اپنے گھر کی صاف ستھری فضا میں مگن رہتے۔ غربت ہمارے لیے مطلق باعث تذلیل نہیں تھی۔ ہم بڑے "دھڑلے" سے غریب تھے۔

ہمارے والدین کو ہم سے جو "نیک توقعات" وابستہ تھیں۔ ان کے اظہار کا انداز بھی نرالا ہی تھا۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت یا کسی

خوشی کے موقع پر وُہ ہمیشہ یہی کہتے۔ "خدا تمہیں اپنے بچوّں کی خوشی دکھائے"۔ مطلب یہ ہی ہوتا تھا کہ ہم اپنے بچوّں سے وابستہ توقعات کی روشنی میں والدین کے ہمیشہ تابعدار رہیں۔

ہم پر خانہ بدوشوں کی اُولاد کی طرح ہمیشہ لفظ "بے ضرورت" کا ٹھپّہ لگا رہا۔ اور اسی "بے" کی سَرپرستی سے نکلنے کے لئے ہم ساری عمر ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ ہمارے والدین تو بس اپنی سی یہی کر سکے کہ "آزادی کے متوالوں" کی فوج ظفر موج تیار کر دی اور "نچنت" ہو بیٹھے۔ آپ اپنی نجات کی رَاہ تلاش کرنا ہمارا کام تھا۔

ہم سب بہن بھائیوں کو تعلیم جاری رکھنے کے لئے جز وقتی کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے ہم بڑی فراخدلی سے حقیر سے حقیر کام کرنے کو تیار ہو جاتے۔ تاہم جب کوئی ضرورت سختی سے سر پر آ بجتی اور یہ نظر آتا کہ اب اس سے "مَفر" نہیں۔ تب بھی وہ ٹل ہی جاتی۔ ہماری امی اس سارے مسئلہ کو دو لفظوں میں نمٹا دیتیں۔ "نہیں ابھی نہیں"۔ ان نادر شاہی لفظوں کی ابھی گُونج بھی ختم نہ ہوتی کہ اس ضرورت کا احساس ختم ہو جاتا۔

ہماری زندگی بہتات سے پُر تھی رشتہ داروں کی بہتات

کپڑے مکوڑوں کی بُہتات، بلیوں کُتوں کی بہتات، کتابوں گانوں، مار کٹائی، شادی بیاہ، بیماریوں، توہمات اور کاٹ کباڑ کی بہتات غرض اس لمبی چوڑی فہرست میں کونسی چیز تھی جس کی ہمارے گھر میں "بہتات" نہ تھی

آئینی طور پر اگرچہ ہم پر اوّل درجہ کے شہری حقوق کا اطلاق ہوتا تھا لیکن ہمیں جو چیز بھی مُیسّر آتی ہمیشہ دوسرے درجہ کی ہوتی تھی۔ ہمارے گھر میں جو فرنیچر تھا وہ کبھی کباڑیے کی دکان کی زینت بن چکا تھا۔ مگر جب سے وہ ہمارے گھر منتقل ہوا تھا ہمیں اس میں ہزارہا خوبیاں نظر آنے لگی تھیں مثلاً یہ کہ یہ فرنیچر اتنا اچھا ہے کہ بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے کپڑے بھی ہمیشہ سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کی دکان سے ہی خریدے جاتے تھے لیکن یہاں بھی ہم ان کے پہننے اور استعمال کرنے والوں کی نفاست طبع کی داد دیا کرتے تھے کہ کس قدر سلیقہ سے ان لوگوں نے کپڑوں کا استعمال کیا ہے کہ ذرا بھی خراب نہیں ہوئے۔ غرض جو چیز اپنی دسترس میں تھی وہ دست بدست منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پوری قوم کی جملہ ناپسندیدہ "بدوضع اور بدرنگ" چیزوں کے جائز وارث ہم ہی ہیں۔

ہمارے پڑوس میں ایک بڑا سے نما بازار بھی تھا۔ جہاں ہر وقت گاہکوں اور دکانداروں میں چخ چخ رہتی۔ سڑی ہوئی پیاز، پالا مارے ٹماٹر اور گلی سڑی سبزیوں کے لئے وہ ہنگامہ برپا رہتا کہ خدا کی پناہ جو چیزیں بند ڈبوں میں بکتی تھیں ان پہ کبھی کوئی لیبل نظر نہ آیا۔ ہم انہیں "حیرت ناک ڈبے" کہا کرتے تھے کیونکہ کھولنے پر ان میں سے عجیب و غریب بدبودار چیزیں برآمد ہوتیں۔ اس بازار میں بنیان جانگیے اور زیر جامے، دکانوں کے سامنے بانسوں پر اس انداز سے لٹکائے جاتے تھے کہ ہر آنے جانے والے کی عبرت کا سامان مہیا کریں۔

اس مفلسی میں لے دے کر ایک ہی چیز ہماری دسترس میں تھی اور وہ تھی گھر کی صفائی۔ اس میں کیونکہ ہلدی لگتی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آتا اس لئے ہماری امی گھر کی صفائی کا کام صبح چار بجے سے شروع کر دیتیں۔ ہم غریب بچے جو اس کپکپاتی سردی میں اتنے سویرے نہیں اُٹھ سکتے انہیں جگانے کا ایک نادر طریقہ انہوں نے دریافت کر لیا تھا یعنی یہ کہ بغیر کسی پس و پیش کے وہ ایسے تمام بچوں کو بستروں میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیتیں ظاہر ہے کہ چھوٹے بچوں کو بستر سے بھگانے کا یہ بہترین نسخہ تھا۔

ایک دن بدنصیبی سے کہیں مجھے بخار نے آدبایا۔ چنانچہ مجھے اسکول سے اِس ہدایت کے ساتھ بھیجا گیا کہ میں گھر جا کر آرام کروں۔ گھر آکر دیکھا تو امی جان اس وقت گھر کی صفائی کی مہم سَر کرنے میں مصروف تھیں اور حسبِ دستور سارے گھر کے بستر لپیٹ کر رکھے جا چکے تھے۔ اب بھلا میری اتنی مجال کہاں کہ میں بستر بچھا کر اُس پر لیٹنے کی جرأت کرتا۔ البتہ نہایت عاجزی سے انتانی کے فرمودات ان کے گوش گذار کیے۔ انہوں نے حیرت سے ایک نظر مجھ پر ڈالی، اور بڑی بے اعتنائی سے بولیں۔ کیا واقعی؟ مگر مشکل تو یہ ہے کہ تم لیٹو گے کہاں؟ میں نے ابھی تو تمام بستر تہہ کر کے رکھے ہیں۔

ان کی صفائی کی مہم میں ہم بچوں کی جسمانی صفائی بھی شامل تھی۔ مگر دِقّت یہ تھی کہ وہ ہماری صفائی بھی اِسی انداز سے کرتی تھیں جس طرح سے گھر کے فرش کی۔ جس دن ہمارے غسل کا حادثہ ہونے والا ہوتا غسل خانے سے کاٹھ کباڑ نکال کر اسے صاف کیا جاتا۔ پھر شکار کی مانند گھیر گھار کر ہمارا اس طرف ہانکا کیا جاتا۔ مگر جس بچے کو امی جان اپنا پہلا شکار بنانے کو لپکتیں وہی داؤ پیچ دے کر یہ جا وہ جا ہو جاتا۔ بہرحال کوئی نہ کوئی ان کے ہتھے چڑھ ہی جاتا۔ اب آخری حربے آزمائے جاتے۔ امی ابھی نہیں ابھی تو مجھے شدید زکام ہے نمونیہ ہو جائے گا۔ یا "میرے

کان میں درد ہے۔" مگر توبہ کیجیے امی کے فولادی عزم کے آگے کس کی پیش جا سکتی تھی۔ باری باری سب کا غسل ہو کر رہتا اور وہ بھی اس شان سے کہ کبھی کانوں میں تنکے ٹھونسے جا رہے ہیں تو کبھی انہیں ناکافی سمجھ کر قلم کی ڈنڈیاں کانوں میں ڈالی جا رہی ہیں اور جو ذرا چوں چرا کی تو فوراً ڈانٹ پڑی کہ اور کرو گندے کان اور بھرو کانوں میں میل۔ کانوں کے محاذ سے نمٹنے کے بعد بدن پہ توجہ ہوتی اور جھانویں کے گھسّے شروع ہو جاتے۔ معلوم ہوتا کہ بدن پر سے میل نہیں بلکہ کھال اُتاری جا رہی ہے اس پر طرہ یہ کہ چُپ رہو گویا چپ چاپ کھال اتروا ؤ۔ مگر مشکل تو یہ تھی کہ وہ ہمارے ضبط و برداشت کے مسلسل امتحان پہ تُل جاتیں۔ یعنی انہیں ایک دم خیال آتا کہ کہیں ہمارے سر میں جُوئیں تو نہیں ہیں پس اِس خیال کے آتے ہی وہ دُنیا بھر کی جراثیم کُش ادویات ہمارے سر پر انڈیل اک کھر یرے نما برش کو ہماری چندیا پر رگڑنا شروع کر دیتیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ برش ہماری چندیا پر رگڑا نہیں بلکہ کھوپری میں اُتارا جا رہا ہے اور پھر جو ہماری فلک شگاف چیخیں بلند ہوتیں تو اچھے اچھوں کے جی دہل جاتے۔ مگر ہماری امی بڑی بے نیازی سے مفروضہ جوؤں کے قتلِ عام میں مصروف رہتیں۔

اُستاد کی تعظیم کرنے اور پابندی سے اسکول جانے کی ہدایت تو خیر

سبھی ماں باپ کرتے ہیں مگر ہمیں اِس کے علاوہ والدین کے، جن احکامات کی تعمیل لازم تھی ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ سکول سے کسی بچے کی شکایت گھر پر نہ آنے پائے۔ بظاہر تو اُستاد اور ماں باپ کی دھمکیوں کا مارا ہر بچہ یہی کوشش کرتا ہے کہ "اس کے کرتوت" ایک حلقہ سے دوسرے حلقہ میں "الم نشرح" نہ ہونے پائیں لیکن تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے! ایک دم شکایتوں کا جو سلسلہ چلا تو یکے بعد دیگرے یہ حادثے وارد ہوتے گئے۔ ایک بار تو خیر امّی نے معافی دے دی مگر دوسری دفعہ تو سراسر جان کے زیاں کا اندیشہ تھا۔ جُرم کی سنگینی کے پیشِ نظر امّی کو یہ پیغام پہنچانے کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی کہ ہمارے طفیل سکول میں تمہاری طلبی ہوئی ہے۔ فی البدیہہ عقل نے کام کیا کہ خالہ ہمسائی کی خدمات اس ضمن میں کیوں نہ مستعار لی جائیں۔ چنانچہ امّی کی بیماری کا بہانہ کر کے ان سے سکول چلنے کی درخواست کی۔ ادھر خالہ اپنی اس عزت افزائی پہ نہال نہال، ادھر ہم کہ کیا غچہ دیا ہے محترمہ کو۔ مگر وہاں تو قسمت ہی پھوٹی نکلی۔ جوں ہی خالہ ہمسائی نے ہمارے کارناموں کی داستان سُنی آؤ دیکھا نہ تاؤ بھری کلاس میں اِس لحیم شحیم بلنتہ سے جو ہمارے گلے کی زینت بنا رہتا تھا وہ ٹھکائی فرمائی کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ امّی سے جو اپنے جرائم کی پردہ داری مطلوب تھی

وہ تو ہو گئی پر غالبہ ہمسائی کے ہر ڈھول پر یاد آتا تھا کہ اپنی اماں ٹیپائی کے وقت بھی کس قدر مروت ملحوظ خاطر رکھتی تھیں۔

ہمارے گھر میں ڈاکٹر کا داخلہ صرف اس وقت ممکن تھا جب یہ یقین ہو جاتا ۔ کہ مزید تاخیر میں بیمار کا رشتۂ حیات منقطع ہونے کا ڈر ہے۔ کسی گھر میں ڈاکٹر کی آمد سے ہی مرض کی شدت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ تاہم ہمارے علاقہ کی خواتین بھی اپنے تجربات میں کسی ماہر ڈاکٹر سے پیچھے نہ تھیں۔ اس زمانہ کا رائج الوقت مجرب نسخہ ایک ہی تھا اور وہ تھا "کیسٹرائل" جہاں کوئی بچہ بیمار پڑا اور کیسٹرائل کی دوائی دی جاتی مگر اس کا نام سننے ہی بچے کا مرض رفوچکر ہو جاتا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور چلاتا "میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک ہوں"۔ دوسرا مجرب نسخہ السی کی پلٹس کا تھا جس کا فراخدلی سے استعمال کیا جاتا۔ اگر کبھی "علاج بالغذا" کی طرف توجہ ہو جاتی تو فوراً، ادرک اور پیاز کے ملغوبے تیار ہونے لگتے۔ ان حالات میں جملہ مریضوں کو بیمار ہونے کا ارادہ ہی ملتوی کرنا پڑتا۔ کبھی مرض کے دفعیہ کے لئے ادرک اور فینائل کی گولیوں کے ہار زیب گلو کرنا پڑتے۔ ہر بیمار کے جسم سے بخارات نکالنا ضروری سمجھا جاتا جس کے لئے اس بے چارے کو اوٹ پٹانگ قسم کے مجربات کھلا کر پسینہ میں شرابور کر دیا جاتا۔ مقصد تو صرف یہ تھا کہ فاسد مادے گرمی سے گھبرا کر بدن سے نکل بھاگیں۔ آج کل ڈاکٹر جن دواؤں کو صرف بدن

پر ملنے کے لئے بتاتے ہیں۔ ہم جیسے سخت جان ان دنوں نہیں کھایا کرتے تھے۔ بخار کی شدت کا اندازہ لگانے کے لئے تھرمامیٹر کا استعمال ضروری نہ سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی کو بخار آجاتا تو اُمّی جان اپنے ہونٹ مریض کے لئے ماتھے پر رکھ کر بخار کی تیزی کا پتہ لگا لیتیں۔ ہمیشہ یا تو بخار بالکل ہی ہلکا نکلتا یا بدن آگ کی طرح گرم بتایا جاتا۔

اگر کسی مرض کے سمجھنے سے امی کی عقل قاصر رہتی تو فوراً پڑوسیوں کی دہائی دی جاتی۔ وہ منظر قابل دید ہوتا تھا۔ محلہ کی خواتین کا قافلہ مریض کے گرد جمع ہے اور ہر ایک اپنے تیر بہدف نسخوں کی شان میں "رطب اللسان" اس کی آزمائش پر مصر ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی اسے اُلٹی کراؤ۔ دوسری جانب سے صدا بلند ہوتی کہ نہیں اسے لیموں چوسنے کو دو۔ ابھی مریض کے متعلقین یہ فیصلہ بھی نہ کر پاتے کہ مریض کو الٹی کرائی جائے یا لیموں چوسایا جائے کہ مزید مشوروں کی "یلغار" شروع ہو جاتی "اسے اکڑوں بٹھا کر اس کے سر پر تین دھپ لگا دو" "الٹا لٹا دو" "نائی کو بلا کر اس کا سر منڈوا دو" اور پھر یہ سارے پُر خلوص مشورے ایک ایک کر کے آزمائے جاتے۔ اگر بد نصیبی سے فوری فائدہ نظر نہ آتا تو آخری حربے کے طور پر متفقہ فیصلہ یہ ہوتا کہ ملک الموت کو دھوکا دینے کے لئے بچے کا نام بدل دو اور

واقعی ملک الموت دھو کا کھا جاتا - کیونکہ اتنے سارے ہمدردوں کی فوج کے آگے اس بے چارے کی کیا پیش جا سکتی تھی -

ہم اور ہمارے پڑوسیوں کے درمیان جو اپنا پیت کی روح کارفرما تھی- عام لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے - ہم لوگ ہجوم میں جینے اور ہجوم میں مرنے کے قائل تھے - اگر خدا نخواستہ محلہ میں کوئی چل بستا تو جب تک کہ محلہ کا ایک ایک فرد مرنے والے کی بیماری، عمر، پسماندگان کی تعداد اور ان کے مستقبل کے بارے میں اطمینان نہ کر لیتا چین سے نہ بیٹھتا- اپنائیت کی انتہا یہ تھی کہ اگر کسی کے گھر سے کوئی خط آتا تو محلہ والوں کا ایک ایک شخص پڑھتا - پھر بچے اس کے ٹکٹ اُتارتے اور پھر وہ سارے محلہ والوں کی تبصروں کی گونج میں متعلقہ شخص کو پیش کر دیا جاتا -

ہمارے گھروں کے باورچی خانے سیکیورٹی کونسل کا سماں پیش کرتے تھے - جہاں بیٹھ کر خواتین پورے محلہ کے مسائل پر تبصرہ کرتیں اور اپنے فیصلے صادر کرتیں - شادی، بیاہ، اغوا، بیروزگاری، پیدائش، غرض ہر مسئلہ پر بے تکان اور بے لگام ہو کر گفتگو کی جاتی - پھر جس ذات شریف کو زیر بحث لایا جاتا اس میں پوری رازداری کا لحاظ رکھتے ہوئے، اشارے کنایوں سے کام نکالا جاتا مگر اشارے اس انداز سے کیے جاتے کہ پوری بات واضح ہو جاتی اور عین اُس وقت جب کہ گفتگو کسی نازک موڑ پر ہوتی

اور ہمارے ننھے ننھے دماغ اسے سُننے میں محو ہوتے کہ امّی پکار اُٹھتیں "ارے بچے" اور ساری محفل پر سناٹا چھا جاتا۔ اس وقت معلومات میں کمی رہ جانے سے وہ کوفت ہوتی کہ حد نہیں۔

ایک دوسرے کی بیٹیوں کی شادی کرانا بھی ہمارے محلہ کی خواتین کے فرائض میں شامل تھا۔ چنانچہ آس پاس کا کوئی باروزگار لڑکا ایسا نہ تھا۔ جس کو ہمارے علاقہ کی کسی نہ کسی لڑکی کے لئے موزوں نہ قرار دے دیا گیا ہو۔ یہ خواتین اپنی جاسوسی سے کنوارے لڑکوں کا کھوج لگاتی تھیں۔ ملک کا بڑے سے بڑا جاسوسی ادارہ بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ اس خیال کی معتقد نہیں تھیں کہ شادیاں آسمانوں پر طے ہوجاتی ہیں کیونکہ وہ یہ بات بخوبی جانتی تھیں۔ کہ دوسری منزل والی شائستہ کی شادی اُس وقت تک نہ ہوسکی جب تک کہ انہوں نے لڑکے کی تلاش میں دن رات ایک نہ کردیئے۔ پھر لڑکی کتنی ہی معمولی شکل وصورت کی کیوں نہ ہو اس کی تعریف میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے کہ خدا کی پناہ۔ بے حد موٹی اور چھوٹے قد کی لڑکی کو تندرست اور گداز بدن کا کہا جاتا۔ اگر وہ جاہل مطلق ہوتی تو کہا جاتا کہ وہ عنقریب میٹرک پاس کرنے والی ہے۔ اگر کوئی لڑکی بحید بدصورت ہوتی تو اُسے بے حد ذہین کہہ کر اس کی جملہ خوبیاں اُجاگر کی جاتیں محلہ کی کوئی لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ نظر آجاتی تو فوراً تحقیقاتی کمیشن بیٹھ

جاتا۔ چہار اطراف سے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ لڑکا کیسا ہے؟ کہاں نوکر ہے؟ تنخواہ کتنی ہے؟ اگر وہ کہیں نوکر نہ ہوتا تو فوراً اس کی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر اس کو قابل قبول قرار دیا جاتا "ارے اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ وہ پڑھ رہا ہے اور تعلیم حاصل کرنا کمانے سے ہزار گنا بہتر ہے۔" پھر ان دونوں کی مزید ہمت افزائی کے لئے مزید تبصرہ ہوتا کہ "بہترین جوڑ ہے، دونوں ایک دوسرے کے لئے بے حد موزوں ہیں۔ خدا میری بیٹی کا نصیبہ بھی یوں ہی کھولے۔"

ان سب چہ میگوئیوں کے صلہ میں جب وہ شادی میں مدعو کی جاتیں تو پلاؤ کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے آخری تبصرہ سننے میں آتا۔ "بات اپنے تک ہی رکھئے۔ دولہا دلہن کا کوئی جوڑ تو ہے نہیں مگر خیر ہمیں کیا۔"

(ماخوذ)

# میرے شوہر اخبار نویس

میرے شوہر اخبار نویس ہیں، ایک اخبار نویس میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کے پروگرام غیر یقینی، اوقات غیر معیّن اور زندگی بے ضابطہ ہے۔ ان کے شب و روز انتہائی مصروف اور سخت قسم کی ذہنی کاوش میں گزرتے ہیں۔ مجھے تو مجھے خود انھیں بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ گھر سے نکلنے کے بعد انھیں کہاں کہاں جانا ہوگا، کس کس سے ملنا ہوگا اور کیا کیا کام انجام دینے ہوں گے۔ ان کی زندگی سخت قسم کی سنجیدہ ذمہ داریوں میں گزرتی ہے اس لیے ہمارے گھر پر ہمیشہ سالانہ امتحانوں کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔

وہ کھانا کم کھاتے، چائے اور سگریٹ زیادہ پیتے ہیں، ان کا

زیادہ تر وقت ہوٹلوں میں گزرتا ہے، رات کو ہمیشہ دیر سے گھر آتے ہیں، یہی ایک کامیاب اخبار نویس کی صفات ہیں، اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ ایک کامیاب صحافی ہیں۔

یوں تو وہ روزانہ صبح ناشتہ کے بعد ہی گھر سے باہر چلے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چائے پینے کے بعد وہ باہر کا رُخ کرنے کے بدلے اپنے کمرے کا رُخ کرتے ہیں اور ایک عدد سگریٹ سُلگا کر کرسی پر نیم دراز ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج وہ ضرور گپ لگانے یا کسی تفریحی پروگرام بنانے کے موڈ میں ہیں مگر جلد ہی میری یہ خوش فہمی دور ہو جاتی ہے کیونکہ وہ تو ایک عدد مضمون لکھنے کے موڈ میں ہوتے ہیں جو انہیں اپنے کسی عزیز دوست کے اخبار یا رسالہ کے واسطے تیار کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہوں اور وہ اپنا کمرہ بند کر کے اس طرح غائب ہوتے ہیں کہ ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

میرے شوہر کبھی خالی الذہن نہیں رہتے، ایک بے خودی اور انہماک کی کیفیت ہے کہ اُن پر طاری رہتی ہے۔ اپنی اسی محویت کی وجہ سے وہ بس میں بیٹھنے کے بعد ہمیشہ مقررہ بس اسٹاپ سے پہلے یا بعد میں اُتر جاتے ہیں بعد میں جب دو چار فرلانگ پیدل چل کر

گھر پہنچتے ہیں تو بس کنڈکٹر کی بے حسی سے سخت نالاں کہ یہ لوگ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ہر مسافر سے اس کی منزل مقصود کے بارے میں پتہ ہی کر لیا کریں۔

مشکل تو یہ ہے کہ ان پر مضمونوں کی فرمائشوں کی بھرمار رہتی ہے روزانہ اخبار سے لے کر، سالانہ رسالوں تک سبھی کو ان کے مضامین کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ سب مضمون خواہ حضرات کیونکہ دوست ہی ہوتے ہیں اس لیے آبگینوں کو ٹھیس لگنے کے ڈر سے وہ سب کی فرمائش پوری کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ یوں بھی اپنی دلچسپی کے لیے وہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں اس لیے تین چار کتابوں کے مصنف بھی بن گئے ہیں۔ جن کی اشاعت کا فرض ادا کر کے ان کے بیشتر دوست دوستی کا حق ادا کر چکے ہیں۔۔ کہیں آپ اس سے یہ نہ سمجھ لیں کہ انہیں قلم کی اس گھس گھس کا معاوضہ بھی ملتا ہوگا؟ خدا کے لیے یہ ذکر چھیڑ کر ان کے دوستوں کا دل نہ دکھایئے بس حساب دوستاں در دل ہی رہے تو بہتر ہے۔

میرے شوہر ملازموں کے بڑے ہمدرد ہیں اس لیے ملازموں کے سلسلہ میں میرے رویہ کے ہمیشہ شاکی رہتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ اگر میں کسی ملازم کو کام کے بارے میں کوئی ہدایت بھی دیتی ہوں تو انھیں یہی شک گزرتا ہے کہ میں اسے برا بھلا کہہ رہی ہوں۔ اکثر ایسا ہوا کہ

ادھر میں نے کسی ملازم کو کوئی ہدایت دی ادھر انہوں نے پوچھا "کیوں اس غریب کو ڈانٹ رہی تھیں؟" اور میں حیران ہو کر اپنی صفائی پیش کرنے لگتی ہوں۔ ہر ملازم ان کی نظر میں بہت مسکین اور قابلِ رحم ہے۔ بد سے بدتر ملازم کے بارے میں بھی ان کی یہی رائے ہوتی ہے کہ خدا کا شکر کیجئے ایسا بھی مل گیا، یہی غنیمت ہے۔ اگر بدقسمتی سے انھیں کسی ملازم کے "فرار" کی خبر مل جائے۔ اگرچہ ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے تو وہ مجھ سے اس قسم کے سوال کرتے ہیں:

"وہ لڑکا کیوں چلا گیا؟۔ ضرور آپ اسے تنخواہ کم دیتی ہوں گی، کیا تنخواہ دیتی تھیں آپ؟"

اب جواب میں اگر پندرہ روپے کہتی ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ بیس روپے کیوں نہیں دئے۔ میں پچیس روپے کہوں گی تو وہ کہیں گے۔ کہ تیس روپے کیوں نہیں دیئے اور میرے تیس کہنے پر وہ ہمیشہ پینتیس کی سفارش کرتے ہیں۔

انھیں کسی بھی ملازم سے بات کرنے میں بڑا تکلف ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی تمام ہدایت کا میں ہی "ہدف" بنی رہتی ہوں اور جتنی دیر وہ گھر پر رہتے ہیں مجھے ان کے لیے پیغام رسانی کی خدمات انجام دینا پڑتی ہیں۔

"اس لڑکے سے کہیئے ذرا جلدی سے چائے بنا کر تو لے آئے۔"

"مجھے ایک عدد سگریٹ کا پیکیٹ تو منگوا دیجئے اور ہاں اس سے کہیئے کہ جلد واپس آئے۔"

یا کبھی وہ اپنے کمرے سے قلم پکڑے باہر آئیں گے اور کہیں گے۔ "یہ دیکھئے میرے قلم کی سیاہی ہی ختم ہو گئی اب کیا کروں۔ آپ ہی کسی کو بھیج کر منگوایئے۔"

اپنی اس بے نیازی کی وجہ سے کسی نئے ملازم کی آمد کا پتہ تو انہیں شاید چار دن بعد ہوتا ہے لیکن اس کے رخصت ہونے کا علم پندرہ روز سے پہلے نہیں ہوتا۔

میرے شوہر کی لکھنے پڑھنے کی میز دنیا کے عجائبات میں شمار کی جائے تو درست ہوگا، کیا نہیں ہوتا اس پر، نئے اور پرانے اخباروں کی گڈیاں، خبر رساں ایجنسیوں کی پرانی خبروں کے بنڈل، رسائل اور کتابیں، لمبے لمبے پتلے پتلے کاغذ کے دستے، جن کی لمبائی دیکھ کر مجھے قیامت میں پیش ہونے والا اعمال نامہ یاد آنے لگتا ہے۔ دواؤں کی خالی اور بھری بوتلیں، اردو اور انگریزی کی لغت، انسائیکلوپیڈیا کی دسوں جلدیں، پرانے گزٹ تاکہ پچھلے حوالوں کے کام آئیں، خطوط، دعوت نامے، دھمکیاں، تعریفیں، شکریے کے خط، اچھی اور احمقانہ

غزلیں، اشاعت کے منتظر کچھ طبعزاد اور کچھ چُرائے ہوئے افسانے، ان سب پر مستزاد بے شمار اخبارات و رسائل کے تراشے جو حضرت آدم کی اولاد کی طرح ادھر ادھر بکھرے پڑے رہتے ہیں۔ اسی پر کیا منحصر، بے ترتیبی اور ناہمواری اس میز کی خصوصیت ہے۔ شروع شروع میں میں اس میز کی صفائی کی طرف خاص دھیان دیا کرتی تھی۔ مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ع

ایں خیال است و محال است و جُنوں

میں جن چیزوں کو بے ترتیب اور بکھرا ہوا سمجھتی تھی وہ تو میرے شوہر نے خود اس نادر ترکیب سے رکھی ہیں کہ بوقت ضرورت ڈھونڈنی نہ پڑیں اور ہر چیز ہاتھ ڈالتے ہی مل جائے۔ جن خطوط، اخبار اور رسائل کو میں ردی سمجھ کر پھینکنا چاہتی تھی وہ بھی نہایت اہم نکلے یعنی عین ممکن ہے کہ ان میں سے بعض اور کسی کام کے نہیں تو مزاحیہ کالم کا مواد تو مہیا کر ہی سکتے ہیں۔ اسی طرح پرانے اخبارات کے ڈھیر جو میرے خیال میں صرف باورچی خانہ کی زینت بن سکتے ہیں۔ میرے شوہر کی میز کا سرمایۂ عزیز نکلے

کسی اور کی کیا مجال جو اس میز کے پاس بھی پھٹک جائے۔ البتہ اگر میں خود بھی اس کی جھاڑ پونچھ کر کے گرد و غبار صاف کر دوں، تب بھی

تمام چیزوں کو اس طرح رہنے دینا بے حد مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ میں بدقت اُن کی کتابوں اور کاغذوں کو اسی بے ترتیبی سے رکھنے کی کوشش کرتی ہوں اس کے بعد بھی انہیں یہ خدشہ رہتا ہے کہ ان کی تمام چیزیں کھوگئی ہوں گی ۔ میرا خیال ہے کہ گرد صاف ہو جانے کی وجہ سے کتابوں کی شکلیں اجنبی معلوم ہونے لگتی ہوں گی ۔

میں تو خیر اپنے شوہر کی اس دماغ سوز مصروفیت سے تنگ ہوں ہی ، مگر کبھی کبھی وہ خود بھی قلم کی اس ہر وقت کی گھِس گھِس سے گھبرا اٹھتے ہیں ، پھر سیر و تفریح کے پروگرام بننے لگتے ہیں اور اس قدر سنجیدگی سے ، معلوم ہوتا ہے کہ اِبکی بار تو واقعی ہم بھی خدا کی اس مخلوق کی برابری کر ہی سکیں گے جسے دنیا کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے ۔ لیکن دو چار ہی دن کے بعد ان کی مصروفیتوں کے طوفان کا جو ریلا آتا ہے تو تفریحی پروگرام کا خیال ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی باقی نہیں رہتا ۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے میرے ساتھ صبح کی سیر کا پروگرام بنایا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کہ انھیں علی الصبح جگا دیا جائے تاکہ وہ صبح کی سیر سے تو محروم نہ رہ جائیں ۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ رات کو روزانہ دیر سے سونے کی وجہ سے صبح ان کے لئے اٹھنا ممکن نہیں ۔

میرے شوہر کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں ان کے مضامین، یا اداریوں کی تعریف نہیں کرتی۔ مگر میرے لئے ان کی نگارشات کی داد دینا قیامت سے کم نہیں واقعہ یہ ہے کہ میں انہیں داد دینے سے ایسے ہی جی چُراتی ہوں جیسے کند ذہن بچہ لکھنے پڑھنے سے، کیونکہ یہ داد خود میری مظلومی کی فریاد بن جاتی ہے۔ میں ان کے کسی مضمون کی کتنی ہی تعریف کیوں نہ کروں۔ وہ فوراً کہیں گے ارے یہ داد ہے یا بیداد ایسے تو سبھی کہتے ہیں۔ کوئی نکتہ بتائیے، کچھ وضاحت کیجیے جب میں اتمام حجت کی خاطر اس خاص نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہوں تو اکثر انہیں اس سے اختلاف ہوتا ہے پھر وہ مضمون کی اہمیّت کے حامل نکات کو میرے دماغ پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں تو میری طبیعت منغض ہو کر رہ جاتی ہے اور مجھے اپنی اس قدردانی پر گھنٹوں پچھتانا پڑتا ہے۔

میرے شوہر کو شہر کی بسوں کی انتظامیہ سے بھی ایک شکایت ہے کہ بسیں تمام رات کیوں نہیں چلاتے اگرچہ وہ ہمیشہ آخری بس سے ہی گھر کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مگر ان کا اخبار کا کام پھر بھی تشنۂ تکمیل ہی رہتا ہے۔ وہ بارہ بجے رات کو بھی گھر میں سراپا شکایت بنے داخل ہوتے ہیں۔ اکثر یہی جملہ ان کی زبان پر ہوتا ہے کہ ابھی بڑا کام باقی تھا مگر بس بس کی مجبوری کی وجہ سے آنا پڑا۔ چنانچہ انہیں کار خریدنے کی ہر وقت

فکر رہتی ہے تاکہ وہ اطمینان سے اپنا کام ختم کر کے گھر آسکیں۔ مگر میں جانتی ہوں کہ ان کا کام کبھی ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا میں کار خریدنے کے ذکر پر سُنی ان سُنی کر جاتی ہوں ان کی ذاتی کار کی موجودگی میں مجھے بس یہی ڈر ہے کہ کہیں وہ صبح کا تازہ اخبار ہی بن کر نہ رہ جائیں

(بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

# اسے کیا کہیے؟

کیا بُرا وقت آلگا تھا کہ گوری قوموں کے کمپا، لاسہ، پھٹکی سب دھرے کے دھرے رہ گئے اور کالی قوموں نے ان کے ہر پھندے میں پھنسنے سے صاف انکار کر دیا۔ گوروں کی تو روٹی ہی انھیں پھندوں سے چل رہی تھی اب جو پھندے ناکارہ ہوئے تو فاقوں پہ نوبت پہنچ گئی۔ عجب مصیبت میں جان تھی کہ ادھر تو پیٹ کی مار پڑ رہی تھی ادھر رہی سہی عقل بھی جواب دئے جا رہی تھی۔ کیا کریں کیا نہ کریں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ارے دماغ تو دیکھو ان جلے کنڈے کی شکلوں کے کہ اب وہ ان سے بات تک کرنے کے

رَوادار نہ تھے۔ اور جب وہ خود ہی ان سے بات کرتے تو وہ انھیں
اپنے کالے کالے دیلیدے دکھا کر ڈراتے اور اپنی تار کول سی سیاہ
پیشانیوں پر ایسے موٹے موٹے بل ڈالتے کہ دوبارہ نظر ملانے کی
ہمت نہ پڑتی۔ حالانکہ بات وہ ہمیشہ انھیں کے فائدے کی کرتے
تھے، پر وُہ بد دماغ تو اُلٹا ان پر غراتے اور ایک بات بھی سمجھ کر
نہ دیتے۔ ایک تو شکلیں ڈراوُنی اوپر سے ادائیں ہیبت ناک۔
گوروں کا اگر ذرا سا بھی بس چلتا تو ایک ایک کی منڈیا مروڑ کر
ان ڈراوُنی عفونتوں کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیتے اور پہلے
بہتیرا کیا بھی مگر کیڑے مکوڑوں کی طرح ان کی نسلیں اس تیزی سے
بڑھ رہی تھیں کہ وہ مارتے مارتے تھک گئے اور ان کی آبادی نہ
ختم ہونا تھی نہ ہوئی۔ آخر ان کم بختوں کی ذلیل حرکتوں سے تنگ
آ کر وہ اپنا بوریا بستر لپیٹ کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ اور پکا
ارادہ کر لیا کہ اب وہ ان بد ذاتوں کو ہرگز منہ نہ لگائیں گے۔ مگر
بُرا ہو اس پیٹ کا کہ اس کی خاطر انھیں پھر یہ ذلت برداشت کرنا
پڑ رہی تھی۔ تاہم ان بد ذاتوں سے دو بدو کرنے میں صریحاً ان
کی سُبکی تھی۔ لو بھلا! ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ یہ سب ان کے
غلام تھے اور ان کی جُوتیاں چاٹتے تھے۔ وہ انھیں اپنی حکومت کے

زعم میں کیسا کیسا تگنی کا ناچ نچاتے۔ کتنا ذلیل کرتے کہ انکی خودداری ختم ہو جائے اور اگر وہ ذرا بھی چوں چرا کرتے تو نت نئی عقوبتیں دے کر وہ انہیں مکھی اور مچھروں کی طرح مسل کر پھینک دیتے۔ اگرچہ اب ان کا وہ طنطنہ وہ رعب داب خاک میں مل چکا تھا۔ ان کی حاکمیت ملیامیٹ ہو چکی تھی مگر رسّی کے جل جانے سے اس کے بل تو نہیں جلا کرتے۔ وہ آن بان نہ سہی وہ ٹھسّا تو ابھی باقی تھا۔ اس لئے وہ ایسی ترکیب چلنا چاہتے تھے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی بھرم بھی بھاری رہے اور پٹارا بھی خالی نہ رہے۔

ان گوروں کو زیادہ حیرت تو اس بات پر تھی کہ یہ ساری عمر کے کوڑھ مغز اب ایک دم اتنے ہوشیار کیسے ہو گئے کہ ابھی بات بھی ان کے منہ سے نہ نکل پاتی کہ وہ ان کا مطلب تاڑ جاتے۔ ہر چند کہ وہ ان کڑوی گولیوں کو یہ موٹی شکر کی تہ چڑھا کر پیش کرتے تھے مگر یوں لگتا تھا کہ کم بختوں کے بھیجوں میں ایسی دوربینیں لگ گئی ہیں کہ گولی کے اندر کا حال معلوم کر لیتے اور اسے نگلنا تو در کنار چھونے سے ہی انکار کر دیتے۔

"ارے بھلے مانسو! ایڈ لو اور کارخانے لگاؤ"۔ وہ بھلی میٹھی

گولی ان کے سامنے پھینکتے۔" اور دیکھو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ تمہارا ملک ہی اس سے ترقی کرے گا۔"

"اُوں، ہوں!" کالے اپنے گُردے جیسے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں سے اوں ہوں کرتے۔ اس ایڈ کے چکّر کو وُہ اب خوب سمجھتے تھے۔

وار اوچھا پڑتا دیکھ کر وہ دوسری گولی پھینکتے۔ "بھئی تمہارے ہی آدمی ان کارخانوں میں کام کریں گے۔ تمہارے ہی ملک کی بیروزگاری مٹے گی۔"

"ہاں! ہاں ٹھیک ہے۔" کالے بڑی رعونت سے سر ہلاتے، "ذرا صبر کیجیے ہم اس مسئلہ پر سوچیں گے۔"

"ہاں اور دیکھو یہ جو تمہاری بستیاں، جوہڑوں اور گندے پانی کے پوکھروں سے پٹی پڑی ہیں، ہم اس کے لیے بھی تمہیں ایڈ دیں گے۔ اور یہ جو تمہارے کالے، نیلے، پیلے بچّے اپنی سوکھی اور مرگھلی شکلیں لیے پھرتے ہیں۔ جانتے ہو یہ غذا کی کمی کا شکار ہیں۔ ہم ان کے لیے بھی تمہیں مفت دودھ اور مکّھن دیں گے۔"

"ہاں دودھ اور مکھن جلد بھجوائیے۔" سدا کے ندیدے کھانے کے نام پر فوراً ہاں کر دیتے۔ "ہم انہیں اپنے آدمیوں سے ہی

اپنے ملک میں بٹوائیں گے"۔

"خدا سمجھے ایسے کالوں کو"، گورے منمناتے، مگر بے بس تھے، پھر جھک مار کر کھگھیانے پر اُتر آتے۔

"اور وہ ایڈ کب لو گے؟" گورے بڑے ضبط و تحمل سے کام لیتے - کیا زمانہ آگیا تھا کہ لینے والے ہاتھ کی جگہ دینے والا ہاتھ پھیل کر رہ گیا تھا اور اس کی کوئی پرسش نہ تھی۔ اور ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ جب وہ دُور سے بد بو دار سڑے ہوئے سوکھے دودھ کا ایک پیکٹ دکھاتے تو بھک منگوں کے ہزاروں ہاتھ پھیل کر رہ جاتے۔

"کہہ تو دیا جناب جب ضرورت ہو گی لے لیں گے"۔ کالے بڑی تہذیب اور متانت کا ثبوت دیتے ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ ایڈ کا نام سنتے ہی ان کا خون کھول اٹھتا۔ اس ایڈ کے نام پر جس قدر ان کا استحصال گوروں کے ہاتھوں ہوا تھا جب وہ انہیں یاد آجاتا تو ان کی وحشت عود کرنے لگتی، لیکن ایک مجبوری کے تحت انہیں مہذب بننا پڑتا۔

گوروں کے ساتھ اس قسم کے واقعات کالوں کے تقریباً ہر ملک میں پیش آرہے تھے۔ اور ان کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جارہی

تھی۔ یا معبود! کیا بنے گا اپنا؟ ارے یہ کم بخت تو سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔ ادھر ملک کی حالت روز بروز پتلی ہوتی جا رہی ہے مال کے انبار لگے ہیں اور کوئی خریدار نہیں۔ اپنے ملک میں کہاں تک کھپت ہو۔ اور جو پیداوار کم کریں تو بے روزگاری بڑھتی ہے۔ ادھر کالے ان کے مال کی خریداری چھوڑ کر اپنے ملک میں اپنے ذرائع سے صنعتیں قائم کر رہے تھے۔ یہ تو ان ملکوں کا حال تھا جو ایک حد تک اپنی زراعت اور معیشت میں خود کفیل تھے۔ مگر گوروں کے وہ تل برابر کے ممالک جہاں کے باشندوں نے بھوک سے تنگ آکر کالوں کے دیس میں ڈیرے ڈال دئے تھے۔ وہ جب کالوں کے دیس سے نکلے تو دانے دانے کو محتاج ہو کر رہ گئے۔ غیر دیس میں ان کی آبادی اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ اصل وطن کی آبادی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی تھی۔ اور اپنے دیس میں ذرائع کی کمی کے ساتھ جگہ کی بھی کمی تھی۔ اتنے سارے آدمیوں کی بھلا آنکھ کے تل برابر دیس میں کہاں سمائی ہوتی۔

ہر پھر کر اس مشکل کا یہی ایک حل نظر آتا تھا کہ کالوں کو پھر سے غچہ دے کر، انہیں ترقی پذیر ممالک کی صف میں رکھ کر، ایڈ کے چکر میں پھنسایا جائے اور ان کی دولت لوٹ کر اس پر عیش کیا جائے۔ اور

یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔ ماضی میں وہ انہیں ہتھکنڈوں سے کالوں کے دیس میں راج کر چکے تھے۔ اور لطف کی بات تو یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ ایڈ دی جاتی اور صنعتی اور سماجی ترقی کے سبز باغ دکھائے جاتے۔ مگر بات جہاں کی تہاں ہی رہتی۔ اوّل تو کام اس قدر سُست رفتاری سے کیا جاتا کہ کالوں کی ایک نسل تو اس ترقی کی حسرت دل میں لیے اللہ کو پیاری ہو جاتی اور جب دوسری نسل کو اس ترقی کا جلوہ دیکھنا نصیب ہوتا تو وہ منصوبہ اس قدر ناقص اور غیر مفید ہوتا کہ کالے مارے حیرت کے منہ پھاڑ کر رہ جاتے۔ کہ یا اللہ یہ ہماری ترقی ہے یا تنزّل، پھر ایڈ کے سہارے وہ اپنے گوروں کو کام دلوا کر سارا روپیہ کھینچ لیتے اور جو بچتا اسے مالِ مفت سمجھ کر چند کالے ہڑپ کر جاتے جس سے ملک میں کرپشن اور دھاندلی پھیلتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب سے کالوں کی نئی نسل نے گوروں کی ہر قسم کی ایڈ کا مطلب بھانپ لیا تھا۔ انہیں اپنے دیس سے بیک بینی و دو گوش نکال باہر کیا۔

گورے کالوں کے دیس سے نکلنے کو تو نکل گئے مگر چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے والی مثل تھی۔ وہ بھلا اتنی جلدی اپنے ہتھکنڈے کیسے بھول جاتے۔ لہٰذا ہر دم گھات لگائے

بیٹھے رہتے، نت نئے داؤں پیچ سوچتے کہ کوئی ترپ کا پتہ ایسا چل جائے کہ ان کے پھر سے وارے نیارے ہو جائیں۔

آخر جویندہ یابندہ کے مصداق گوروں کے ایک تل برابر دیس کے باسی کو ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ دراصل یہ ترکیب ایک ایسے گورے کو سوجھی تھی جو کبھی کالوں کے دیس میں عیش کیا کرتا تھا، مگر جب سے اسے دیس نکالا ملا تھا۔ روٹیوں کو محتاج تھا۔ برسوں کالوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ ان کی نفسیات، ان کے طور طریقے اور ان کی معاشرت کو خوب سمجھتا تھا۔ ایک بار جب اس پر دو وقت کا فاقہ گزر گیا تو اس کا دماغ بلند پردازی کی طرف مائل ہوا۔

"اوہ ہو! یوں کیوں نہ کیا جائے، اس نے سوچا کہ ذراسی تبدیلی سے وہی پُرانا پھوٹ ڈالو والا دھندا شروع کیا جائے۔ آخر کالوں کے دیس میں داخلہ بھی تو اسی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے گُر کی بدولت ہوا تھا۔ صدیوں تک ہماری نسلوں نے ان کو لڑوا کر انہیں کی دولت پر عیش کیا اور چین کی بانسری بجائی ہے۔"

"مگر اب یہ لوگ ہماری چالوں میں نہیں آنے کے، اب یہ ہمارے چکّروں کو خوب سمجھ گئے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو کیسے چوکنے رہتے ہیں۔" کسی نے صورت حال کا جائزہ لے کر مایوسی کا اظہار کیا۔

"ارے بھائیو! ابھی ایک پتّا باقی ہے اور وہ بھی تڑپ کا سنو گے تو پھڑک جاؤ گے۔" فاقہ زدہ نے اپنی نیم وا آنکھ ماری۔

"ارے چھوڑو! اپنا تو دماغ سوچ سوچ کر شل ہی ہو گیا مگر کوئی نادر ترکیب سمجھ کے پاس تک نہ پھٹکی۔"

"ارے مجھ سے تو سنو! اب کی بار ان کالوں کے مردوں اور عورتوں میں پھوٹ ڈالی جائے۔ سارا سبق اسی انداز سے دُہرایا جائے گا صرف چند الفاظ بدل جائیں گے۔ یعنی اپنے دس پانچ جاسوس ان کی عورتوں میں چھوڑنا ہوں گے پھر ان خواتین سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے مرد جو تم پر اس قدر ظلم کر رہے ہیں۔ اس کا تو صرف ایک ہی علاج ہے کہ تم ان سے آزادی حاصل کر کے اپنا دیس ہی الگ بنالو۔ تب تمہیں ان کے مظالم سے نجات مل سکے گی۔ ورنہ یُّھی پستی رہو چکّی میں۔ اور دیکھو چوٹ ہمیشہ گرم لوہے پر مارنی چاہیئے۔ اس وقت ان کی عورتوں میں تعلیم کی بدولت خود اعتمادی اور خود شناسی کا جذبہ اُبھر رہا ہے۔ ایسے وقت میں بس ذرا سی ہوا دو تو یہ دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے گی۔"

"پر اس میں ایک خطرہ بھی ہے۔" سننے والا دُور کی کوڑی لایا۔

"کیا؟"

"یہی کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری عورتیں بھی ان کے پاؤں تلے کی لے ڈالیں اور اس چکّر میں پڑ کر ہم ایک نئی مصیبت میں پھنس جائیں۔"

"اوہ نہیں! خاطر جمع رکھو ہماری عورتیں آخر تو ہماری ہی طرح گوری اور عقل مند ہیں وہ ایسی حماقتیں نہیں کریں گی۔"

"ٹھیک ہے کہ نہیں کریں گی مگر کوئی قدم اٹھانے سے پہلے معاملے کے ہر پہلو پر غور کر لینا بہتر ہے۔ ایمان کی کہنا کیا ہم اپنی عورتوں کا کچھ کم استحصال کر رہے ہیں۔ ارے یہ ناچ گانا، نائٹ کلب یہ ننگے لباس یہ سب تفریح اور آزادی کے نام پر ان کی خودداری ان کے وقار اور ان کے تقدس کی تضحیک نہیں تو اور کیا ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار رہوں کہ ہماری عورتوں میں سرے سے عقل ہی نہیں ہوتی ورنہ وہ اس مسئلے پر ضرور احتجاج کرتیں اور اپنی یہ درگت ہرگز نہ بننے دیتیں۔ بیوقوف اس معمولی سے نکتہ کو بھی نہیں سمجھتیں کہ یہ حرکت جو وہ ہمارے اشاروں پر کرتی ہیں، اگر اتنی ہی پسندیدہ اور قابل ستائش ہیں تو ہم مرد انہیں اختیار کیوں نہیں کرتے۔ ہم خود کیوں ننگے دھڑنگے نہیں پھرتے۔"

"ارے خدا کے لیے۔ آئندہ سے یہ باتیں اپنے منہ سے نہ نکالنا

یہ تو وہی گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے والا بات ہو گئی۔ یعنی عین اُس وقت جب ہم دشمن کے گھر کو نشانہ بنانے کی سوچ رہے ہیں تم اپنے ہی گھر پر بمباری کر کے اسے ڈھانے کی سوچ رہے ہو اور پھر قبل از مرگ واویلا۔ دیکھا جائے گا جب ہماری عورتیں بغاوت پر آمادہ ہونگیں ہم کالوں کی طرح اتنے احمق نہیں کہ آپس میں ہی لڑ مریں۔ ہماری مصلحت اندیشی کا تو ایک عالم گواہ ہے۔ یاد نہیں ہے جب ہماری عورتوں نے ووٹ اور مردوں کے برابر کام کا حق مانگا تھا تو ہم نے انہیں دیر سے ہی مگر ان کا حق دے تو دیا تھا۔ رہا کام کا معاملہ تو اس کے لئے ہم نے تھوڑا بہت دے کر انہیں ایسا چکر دیا کہ مطمئن ہو کر بتاشے کی طرح بیٹھ گئیں۔"

پر اب ڈر تو یہی ہے کہ کالے بھی ہمارے نقش قدم پر چل کر ہمیں مات نہ دے دیں۔ اور اپنی عورتوں سے مصالحت کر لیں۔

"او! ہو! تم ابھی تک ان کالوں کی فطرت کو نہیں سمجھے! بھئی بلا سوچے سمجھے جھگڑا اُٹھا کر لینا، حقیر اور بے معنی باتوں کو اپنے وقار کا مسئلہ بنانا، دوسرے کے نقطۂ نظر کو نہ سمجھنا کالوں کے مزاج کا خاصہ ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم ان کے دیسوں پر صدیوں راج ہی کیوں کرتے۔ یاد نہیں ہے کہ برسوں انہیں کے ہاتھوں ہم

ان کے بھائی بندوں کا قتلِ عام کراتے اور پاؤں پھیلا کر چین کی نیند سوتے رہے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ چیونٹی کے سر جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان میں آپس میں ٹھن جاتی اور وہ خون کی ندیاں بہتیں کہ ان کی وحشیانہ حرکتوں پر ایک بار تو ہمارا گوارا وجود بھی لرز اٹھتا۔"

"مگر یار ذرا یہ تو بتاؤ کہ انھیں آپس میں لڑایا کس ترکیب سے جاتا تھا؟"

"ارے بھئی کوئی ایک ترکیب ہو تو تمہیں بتاؤں جب نفاق ہی پیدا کرنا ٹھہرا لہٰذا کبھی مذہب کے نام پر انہیں آپس میں بھڑا دیا۔ کبھی صوبائی تعصب کو ہوا دے دی کبھی زبان کا جھگڑا کھڑا کر دیا اور کچھ نہیں تو ان کی ذات برادریوں میں آپس میں چلوا دی۔ ادھر ہم ساتھ ساتھ دونوں فریقوں کو تھپکی بھی دیتے جاتے کہ استاد ڈٹے رہو تم ہی حق پر ہو اور ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ بس پھر کیا تھا وہ بدنصیب عقل کے اندھے ہماری شہ پر اتنے شیر ہو جاتے کہ کہتے ہم آپس میں مل کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمارے حصہ کا ملک ہمیں بانٹ دو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہماری دلی مراد بر آتی اور ہم آنکھیں بند کر کے نقشہ پر ایک لکیر مار دیتے ملک بٹ جاتا اور مسائل کا ایک طوفان

اٹھ کھڑا ہوتا۔ جس سے آپس کی رنجشیں اور بڑھتیں اور مڈبھیڑ ہوتی اور وہ ہماری چالوں سے بے خبر اپنی حماقتوں کے جال میں گرفتار تڑپتے رہتے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں فریق شل ہو جاتے تو اس ڈر سے کہ کہیں یہ تھک ہار کر آپس میں مل ہی نہ بیٹھیں ہم ایک اور شوشہ چھوڑ دیتے یوں پھر سے ایک نیا سلسلہ چل پڑتا۔ لطف تو یہ ہے کہ آپس کے جھگڑوں میں انہیں اپنے تن پیٹ کی کبھی فکر ہی نہ ہوتی۔ حالت یہ تھی کہ جس طرف دیکھو لنگوٹ باندھے فاقہ ماری شکلیں نظر آتیں۔ بعض دفعہ تو ان پُرہیبت ڈھانچوں کو دیکھ کر ہماری بھی گھگھی بندھ جاتی مگر ان فاقہ مستوں کو اپنے لڑائی جھگڑوں سے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ سوچتے کہ ہم کن ہتھکنڈوں سے ان کے منہ کا نوالہ چھین رہے اور انہیں چیتھڑے لگوا رہے ہیں۔

ہا! ہا! ہا! مخاطب قہقہہ مار اٹھے۔ "شیر کو بھوکا رکھ کر ہی قابو کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اسے پیٹ بھر کر ملے تو انسان کو چیر پھاڑ کر نہ رکھ دے اور شیر کی تو بات چھوڑو میں کہتا ہوں کہ اگر کہیں ان سیاہ قوموں کو ہی تن بھر کپڑا اور پیٹ بھر روٹی جُڑ جاتی تو یہی ہمیں کچا چبا جاتے۔"

"بالکل! بالکل جناب۔ ہر چند کہ یہ کالے بڑے چالاک ہو گئے ہیں اور انہیں آپس میں مل جُل کر رہنا آتا جا رہا ہے۔ لیکن اپنی عورتوں

کے معاملہ میں یہ ابھی تک کسی رورعایت کے قائل نہیں۔ ایک برتری کا نشہ ہے کہ جس میں یہ جھوم رہے ہیں اور اپنی عورتوں پر آج بھی اس سنگ دلی اور بے رحمی سے حکومت کر رہے ہیں کہ ہماری صدیوں کی جارحیت بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتی۔

"ارے تو پھر تو یوں سمجھو کہ بم پھٹنے ہی کو ہے صرف چوٹ لگانے کی دیر ہے۔ اور اتنا تو طے ہے کہ نہ تو اپنا وار کبھی خالی گیا اور نہ اپنے کاٹے نے کبھی پانی مانگا۔"

دوسرے ہی روز اس فاقہ زدہ نے اپنے دیس کے ایک ذمہ دار افسر کو اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ فی الحال بات کو صیغۂ راز میں رکھا جائے کہ کہیں دوسرے ملک کے گورے اس زریں منصوبے کو نہ لے اُڑیں۔ صفا بات ہے اس وقت سب کو اپنے اپنے پیٹ کی پڑی ہوئی ہے اور ہاں "چلتے چلتے" انہوں نے متعلقہ افسر کو پٹی پڑھائی۔ اگر ہم کالے مردوں اور عورتوں میں پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب ہو گئے تو ملک پر قبضہ کئے بغیر ہی اپنے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

"وہ کیسے؟ وہ کیسے؟" افسر اتنی گہری بات نہ سمجھ سکا۔

"میں بتاتا ہوں جب جنگ ہو گی تو اسلحہ کی ضرورت بھی تو

ہو گی اور ہم ہی تو دونوں فریقوں کو اسلحہ مہیا کریں گے۔ پھر تو اسلحہ کی وہ کھپت ہوگی کہ اگر ہماری فیکٹریاں دن رات بھی چلیں گی تو مانگ پوری نہ کر سکیں گی۔ تاہم یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ان کی عورتوں میں چار پانچ جاسوس چھوڑ دیے جائیں اور میں اس سلسلہ میں اپنی خدمات حکومت کو پیش کرتا ہوں۔ آپ صرف ہمیں اس ملک کا ویزا دلوا دیں۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ہم لوگوں کو سیاحت کے لئے ہی وہاں بھیجنے کا انتظام کر دیں۔ ایک بار داخلہ ملنے کی دیر ہے پھر بھلا کس کی مجال ہے کہ ہمیں وہاں سے نکال سکے۔

حضرت تم نے تو بڑا زرخیز دماغ پایا ہے۔ مطمئن رہو۔ میں آج ہی بھاگ دوڑ کر کے افسرانِ بالا سے مل کر تم لوگوں کے وہاں بھیجنے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

بالآخر بڑی کوشش سے چار پانچ گوروں کو کالوں کے ایک دیس میں داخلہ مل گیا۔ دیکھا بھالا دیس تو تھا ہی، کچھ پرانی واقفیتیں بھی تھیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے بہت جلد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں سے دوستی گانٹھ لی۔ رفتہ رفتہ ان سے اظہارِ عشق بھی کر ڈالا تاہم ماضی میں گوروں کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر کالوں کی بیٹیاں ان سے عشق کرنے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ مگر وہ بلا کے عیار ان کے دام سے

نکلنا کوئی آسان کام تھا۔ انہوں نے فوراً گوری عورتوں کے بیوفائیوں کے قصے سنا کر انہیں رام کر لیا۔ مشرق کی بھولی بھالی عورتیں جب ان کے دام محبت میں گرفتار ہو گئیں تو عشق کے ساتھ ساتھ وہ انہیں سیاست کا درس بھی دینے لگے۔ مشرقی عورتوں کی وفا پیشگی اور ایثار پسندی کی تعریف کرنے کے ساتھ گورے عاشق کالے مردوں کے مظالم کی داستانیں بھی دہراتے جاتے۔ بر سبیلِ تذکرہ انہوں نے یہ بات بھی کالوں کی بیٹیوں کے کان میں ڈال دی کہ اگر اس قسم کے مظالم وہ اپنی گوری عورتوں پر کرتے تو یقیناً وہ اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کر دیتیں۔ اور انہیں ان کے مطالبہ کے آگے جھکنا پڑتا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ آج کے آزادی پسند دور میں جبکہ ہر شخص کی غیرت اور حمیت بیدار ہو چکی ہے انسان تو الگ رہے جانوروں کو بھی غلام بنا کر رکھا نہیں جا سکتا۔

"مگر جانور تو بہرحال بے بس ہیں وہ نطق سے جو محروم ہیں!" کالوں کی بیٹیاں ان کے جادو کا توڑ کرتیں۔

"اوہ! ہو! نطق سے محروم ہیں تو کیا ہوا جان تو رکھتے ہیں اسی لیے تو ہمارے دیس میں ایسی سوسائٹیاں قائم ہیں جو جانوروں پر ظلم کرنے والوں پر گرفت کرتی ہیں"۔ گوروں نے جھلے پر دہلا مارا۔

رفتہ رفتہ نفرت کا یہ زہر کالوں کی بیٹیوں کے دماغ میں سرایت کرنے لگا اور وہ کالے مردوں سے بغاوت پر آمادہ ہوگئیں گورے بہرحال ان کے ہمدرد تھے جنھوں نے ان میں یہ جرأت پیدا کی تھی۔ جب کالی عورتوں کی باقاعدہ منظم باغی جماعتیں وجود میں آگئیں تو کالے مرد چونکتے ہوئے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ارے یہ سب کیا ہے؟ بھلا پاؤں کی جوتی کو بھی کسی نے سر پر رکھا ہے۔ یعنی ہمارے پنجہ سے ہی بھاگ نکلنے کی سوچتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ الگ ملک لیں گے۔ گویا ہماری بلّی اور ہم ہی سے میاؤں۔ دیکھتے ہیں کہ کیسے یہ لوگ اپنا علیحدہ ملک بناتی ہیں۔ مار مار کے بھر کس نہ نکال دیا تو بات نہیں۔

"لد گئے وہ دن جب تم لوگ ہمارا بھرکس نکلتے تھے۔ اب اگر ہمارا ایک بھی ہاتھ پڑ گیا۔ تو تم لوگوں کی گردن ادھر سے ادھر جا لگے گی"۔ اب کالی عورتیں بھی برابری پر اُتر آئیں۔ کہتے ہیں دب کر چیونٹی بھی کاٹتی ہے وہ تو آخر انسان تھیں۔

ہیں! ہیں! ہیں کالے مرد ہکّا بکّا رہ گئے یہ عورتیں تو بہت گستاخ ہوتی جا رہی ہیں یعنی ہماری نرمی اور رعایتوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عورتیں ان سے

یوں دوبدو مقابلہ پہ اتر آئیں گی۔

گوروں کی باچھیں کھل کر کانوں تک پہنچ گئیں۔ دیکھا! جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے ہماری دبائی ہوئی چنگاری اب بھڑکنے کو ہے۔ لہٰذا اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کالے مرد ہوش مندی سے کام نہ لے بیٹھیں انہوں نے ان کو ان کی عورتوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔ گورے ملکوں کی عورتوں کی مثال پیش کی جو ان کی ڈھیل سے ان کے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں۔

بس ہمارا انجام نظر میں رکھو اور ان عورتوں کو قابو سے نہ نکلنے دو ورنہ دیکھ لینا ہماری طرح چھینی میں چون لئے پھرو گے اور کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ کچھ پرواہ نہیں اگر جنگ بھی کرنا پڑے تو فکر نہ کرو۔ ہم تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہیں ہم تمہیں بے تحاشا اسلحہ دیں گے۔

یہ سنتے ہی کالے مرد ایک دم رام ہو گئے اور معاملہ کی نزاکت پر غور کئے بغیر عورتوں سے جنگ کرنے کو تیار ہو گئے۔ اور لڑنے کو تیار کیوں نہ ہوتے گورے انہیں پہلے ہی بتا چکے تھے کہ یہ مسئلہ اُن کے اقتدار کا ہے اور اقتدار اگر ایک بار ہاتھ سے دے دیا تو پھر گئے دونوں جہان سے۔ دراصل وہ عورتوں کے اس نعرے سے بوکھلا

اٹھے تھے کہ حکومت میں انہیں آدھوں آدھ کا حصہ دار بناؤ۔ ورنہ علیحدہ ملک دو۔ وہ چاہتے تھے کہ گوری عورتوں کی طرح انہیں بھی ناچ گانے اور ننگا پھرنے کی کھلی چھٹی دے کر لہو و لعب میں ایسا اُلجھایا جائے کہ حکومت کے ایوانوں کا راستہ تک بھول جائیں۔

پر یہ کالی عورتیں جو صدیوں کی نیند سے بیدار ہوئیں تو تازہ دماغ ہو کر اٹھیں وہ اپنے ہوش و عقل سے کام لے کر اس سازشی جال کو بھانپ چکی تھیں جو گوری عورت کو زیرِدام رکھنے کے لئے پھیلایا گیا تھا اور وہ خوب سمجھتی تھیں کہ اس نام نہاد آزادی کے فریب میں آکر گوری عورت پستی کے اس غار میں گر چکی تھی جہاں سے نکلنا تو درکنار نکلنے کا تصور کرنا بھی دوبھر ہے۔ چنانچہ کالی عورتوں نے اپنی پستی اور بدحالی کا واحد حل یہی قرار دیا کہ انہیں الگ ملک دیا جائے یا انہیں حکومت میں برابر کا حصہ دار بنایا جائے پھر یہ سب خرابیاں جو اس محکومی کی پیداوار ہیں دور ہو جائیں گی۔ انہیں خوب پتہ تھا کہ اپنا حق بھکاری کی طرح مانگنے سے نہیں ملتا۔ بلکہ اسے چھینا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جنگ پر آمادہ ہو گئیں۔

حقیقت تو یہ تھی کہ کالی عورتیں اپنے جلسوں میں جب مردوں کو للکار دیتیں تو ان کے ایک ایک لفظ پر ان کا کلیجہ تک دہل

اٹھتا —— "ہم مردوں سے افضل ہیں، تخلیق کا عمل ہم سے ہی وابستہ ہے۔ یہ ساری بستیاں ہماری ہی بدولت وجود میں آئی ہیں۔" مَردوں کی آنکھیں پھیلنے لگتیں۔ ادھر تقریر یہ جاری رہتی۔ "ہم نے اس دنیا کو پیار دیا، حُسن دیا، زندہ رہنے کا جذبہ دیا۔ کیا نہیں دیا ہم نے۔ کائنات کی ساری رنگینی، ساری خوبصورتی ہمارے ہی دم قدم سے قائم ہے۔ ہم زندگی کا محور ہیں۔"

پنڈال کے باہر مرد اپنی پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے سوچتے کہ واقعی بات اب حد سے بڑھ چکی ہے۔ یہ شعور اور یہ احساس جو اب ان عورتوں میں بیدار ہوا ہے وہ شاید دبائے سے دب نہ سکے۔ مگر کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ہنوز دلّی دور است، یہ بیداری نہیں بلکہ بیدار ہونے سے پہلے کی کسمساہٹ ہے اور ابھی بیداری کی منزل دور ہے۔

اب بجائے اس کے کہ مرد دوبارہ خواب خرگوش میں چلے جاتے وہ تو ایک دم جلسوں سے جلوسوں پر اُتر آئیں ہر روز ایک ہنگامہ ہر روز ایک شوشہ آخر مرد جوابی کارروائیوں پر تل گئے۔ جب ڈنڈوں اور لاٹھیوں پر نوبت پہنچی تو دونوں فریقوں میں ٹھن گئی۔ مردوں کا خیال تھا کہ وہ لاٹھیاں کھا کر روتی دھوتی ان کے پاس پہنچیں گی اور

ان کے پاؤں پکڑ کر ان سے معافی کی طلب گار ہوں گی مگر توبہ کیجئے۔ وہ تو سینہ تان کر میدان میں آڈٹیں۔ ڈنڈے اور لاٹھیوں سے بڑھ کر نوبت قید و بند پر پہنچ گئی مگر ان کا وہی دم خم رہا۔ اب وہ اپنے اقتدار اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرانے کی خاطر ہر مصیبت جھیلنے اور ہر ستم اٹھانے کو تیار تھیں۔ مردوں کا ناک میں دم آچکا تھا۔ تنگ آکر انہوں نے جیلوں میں صلح کے پیغام بھجوائے۔

"یہ بیہودگیاں چھوڑ دو اور سیدھی طرح اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آؤ۔"

"بہت خوب!" عورتیں بھنّا اٹھیں۔ "یہ تو بعد میں پتہ چلے گا کہ بیہودگیاں کون کر رہا ہے۔ بہر حال اپنے دماغ ٹھکانے پر رکھئے۔ مصالحت کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔"

"اُفوہ..... ذرا طنطنہ تو دیکھو بھئی یہ عورتیں یوں قابو میں نہ آئیں گی ان نالائقوں سے جیلوں کو خالی کرالو۔ ورنہ یہ مرد قیدیوں کو بھی ورغلا دیں گی۔"

چنانچہ جونہی لیڈر خواتین کو جیل سے رہائی ملی تو وہ اور شیر ہو گئیں اور ہوتی کیسے نہیں۔ گوروں کے پیغام پر پیغام پہنچ رہے تھے کہ ڈٹی رہنا۔ جھکنے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اب تو

لڑکر فیصلہ کراؤ۔ بس جو جیت جائے بازی اسی کے ہاتھ رہے گی۔ لہٰذا جنگ کی تیاریاں شروع کر دو۔ اسلحہ ہم دے ہی رہے ہیں جس کی تعداد عنقریب بڑھا دی جائے گی۔ بس الا اللہ کا نعرہ لگا کر طبل جنگ بجادو۔ میدان تم جیسی بہادر عورتوں کے ہاتھ رہے گا۔

گوروں سے شہ پاکر عورتوں نے مردوں کو الٹی میٹم دے دیا کہ یا تو ان کے مطالبات مان لیے جائیں یا مرد جنگ کرنے کو تیار ہو جائیں۔ عورتوں کے مطالبات ماننے میں تو مردوں کی ہیٹی ہوتی تھی لہٰذا مردانگی یہی قرار پائی کہ الٹی میٹم قبول کر لیا جائے۔

ہر چند کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کم تھی مگر ان میں جوش و خروش اور مردوں پہ غالب آنے کا جذبہ بلا کا تھا۔ ہر گھر کی ہر ہر عورت مسلح اور فن حرب کی ماہر بن چکی تھی، لہٰذا پہلے ہی دن عورتوں کا پلہ بھاری رہا اور مردوں کو وہ چار چوٹ کی مار پڑی کہ عقل ٹھکانے آگئی۔ مردوں کی ساری فوج حیران اور ہکا بکا دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور عورتیں پالے پر پالا مارنے لگیں۔ جب مردوں کے قدم اکھڑنے لگے تو انہیں اپنا انجام تو سے میں نظر آگیا اور وہ جھٹ سفید جھنڈیاں لے کر میدان میں آگئے۔ مگر عورتیں اب کسی قسم کی مصالحت کو تیار نہ تھیں وہ فیصلہ کن جنگ چاہتی تھیں۔ وہ اس بات کو جان گئی تھیں کہ

ایک بار سر دھڑ کی بازی لگا کر دشمن کو شکست دے دو تاکہ ایک ہی بار تمام مسئلے حل ہو جائیں اور روز روز کی اس جھک جھک بک بک سے نجات ملے۔

ادھر سفید قومیں دونوں فریقوں کی ہر قسم کی مدد اور ہمت افزائی کے لئے موجود تھیں جس کے صلہ میں جانبین انہیں ان کی سلامتی اور حفاظت کا یقین دلاتے ہوئے نہ تھکتے تھے۔ ان کا اسلحہ تو دھڑا دھڑ بک ہی رہا تھا اب وہ اس فکر میں تھے کہ یہ جنگ اور طول کھینچے اور ملک میں ہر قسم کے کارخانے بند ہوں —— تو ان کا مزید کاروبار چمکے وہ جنگی سامان کے ساتھ ساتھ اس ملک کو اشیائے صَرف کی منڈی بھی بنانا چاہتے تھے۔

جب تین چار شہروں پر عورتوں نے قبضہ کر کے وہاں اپنی فوجی حکومت قائم کر دی تو مردوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہونے والا ہے؟ کیا ہم اپنی تمام مردانگی کے ساتھ عورتوں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر رہیں گے۔ اس قسم کے سوالات ملک کے ہر مرد کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے مگر جرأت اور بہادری سے جنگ کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ دراصل مدّ مقابل کو صنفِ نازک کہہ کر وہ اس کی جرأتوں اور ہمتوں سے غافل ہو چکے تھے۔ کیا پتہ تھا کہ آج کی

صنفِ نازک صنفِ کرخت بن کر ان سے یوں دو بدو ٹکر لے گی کہ انہیں اپنی بتیسی کی خیر منانی مشکل ہو جائے گی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ جنگ کا فیصلہ عورتوں کے حق میں ہو گا۔ گھبرا کر مردوں کے سفیر عورتوں کی نو آزاد مملکت کی طرف دوڑے۔ عورتوں کی تمام شرائط بلا چوں وچرا مان لی گئیں مگر عورتوں کی فوج کے کانوں میں جوں ہی ان باتوں کی بھنک پڑی وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئیں۔ ہم کسی قیمت پر صلح نہیں کریں گی۔ ہم اس ملک کو اپنے زورِ بازو سے فتح کریں گی۔ ہم جیت رہی ہیں ہم کیوں صلح کریں۔

تاہم ملک کی چند ذمہ دار عورتوں نے جب معاملہ کے ہر پہلو پر غور کیا تو وہ صلح کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مرد اب اس قدر پٹ چکے ہیں کہ حکومت میں آدھے کے ساجھے دار بن کر بھی عملاً عورتیں ہی حکومت کریں گی۔ دوسرے اس لڑائی میں اصل فائدہ تو گوری قوموں کو ہو رہا ہے جو انھیں لڑوا کر نیا اسلحہ بیچ کر دونوں ہاتھوں سے انہیں لوٹ رہے ہیں۔

اب کالوں کی عقلمند عورتوں کے ہاتھوں کالے مرد بھی مار کھا چکے تھے اور وہ گوری قومیں بھی جن کو مکمل اقتدار حاصل کرنے کے بعد کالی عورتوں نے بیک بینی و دو گوش اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا۔